ISSN 0974-7346

اکتوبر ۲۰۲۲ء

جلد۲۰۹—عدد ۱۰

مجلس دارالمصنّفین کا ماہوار علمی رسالہ

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ

DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY, AZAMGARH

سالانہ زر تعاون

ہندوستان میں سالانہ ۳۵۰ روپے۔ فی شمارہ ۳۰ روپے۔ رجسٹرڈ ڈاک ۵۵۴ روپے

دیگر ممالک میں سادہ ڈاک ۱۷۳۰ روپے۔ دیگر ممالک رجسٹرڈ ڈاک ۱۸۵۰ روپے

ہندوستان میں ۵ سال کی خریداری صرف ۱۵۰۰ روپئے میں دستیاب۔

ہندوستان میں لائف ممبر شپ ۱۰۰۰۰ روپے ہے۔

اشتراک پی ڈی ایف بذریعہ ایمیل (ساری دنیا میں) ۳۵۰ روپے سالانہ

ہندوستان اور پاکستان کے درمیان ڈاک کا سلسلہ بند ہے۔

اس لئے فی الحال پاکستان معارف کی ترسیل موقوف ہے۔

سالانہ چندہ کی رقم بینک ٹرانسفر، منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ کے ذریعہ بھیجیں۔

بینک ٹرانسفر کر کے ہم کو ضرور اطلاع دیں۔ بینک اکاؤنٹ کی تفصیلات یہ ہیں:

Account Name: Darul Musannefin Shibli Academy
Bank Name: Punjab National Bank - Heerapatti, Azamgarh
Account No.: 4761005500000051 - IFSC: PUNB0476100

بینک ڈرافٹ درج ذیل نام سے بنوائیں:

Darul Musannefin Shibli Academy, Azamgarh

* زر تعاون ختم ہونے پر تین ماہ کے بعد رسالہ بند کر دیا جائے گا۔
* معارف کا زر تعاون وقت مقررہ پر روانہ فرمائیں۔
* خط و کتابت کرتے وقت رسالہ کے لفافے پر درج خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔
* معارف کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں کی خریداری پر دی جائے گی۔
* کمیشن ۲۵ فیصد ہوگا۔ رقم پیشگی آنی چاہئے۔

Office Mobile: 06386324437
Email: info@shibliacademy.org
Website: http://www.shibliacademy.org

ڈاکٹر فخر الاسلام اعظمی (ڈپٹی ڈائرکٹر) نے معارف پریس میں چھپوا کر دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ سے شائع کیا۔

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی کا علمی و دینی ماہنامہ

معارف

جلد نمبر ۲۰۹ | ربیع الاول ۱۴۴۴ھ مطابق اکتوبر ۲۰۲۲ء | عدد ۱۰

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی

پوسٹ بکس نمبر: ۱۹

شبلی روڈ، اعظم گڑھ (یوپی)

پن کوڈ: ۲۷۶۰۰۱

info@shibliacademy.org

فہرست مضامین

شذرات

ایک شاعرانہ تخیل تھا کہ ابلیس نے موجودہ دور کی دنیا میں اپنے وجود کو غیر ضروری قرار دے دیا۔ وجہ تھی کہ یہ دور جمہورت کا ہے اور سیاست والوں کے ہوتے ہوئے ابلیس کی کیا ضرورت ہے؟ قریب اسی، نوے سال پہلے جب شاعر کے ذہن میں ابلیس نے اس خیال کو منتقل کیا تو اس وقت، جمہوریت پر ایمان لانے والے بہر حال اپنے اس عقیدہ میں پختہ تھے کہ سلطانی جمہور میں عوامی حاکمیت، ابطال وراثت اور تقسیم دولت کے ساتھ بنیادی انسانی حقوق میں مساوات اور عملاً انصاف و عدالت کا ایک عمدہ ذریعہ یہی جمہوریت ہے، اگرچہ یہ خدشہ بھی ہمیشہ رہا کہ سروں کی گنتی پر مبنی نظام کسی وقت بھی آمریت اور فسطائیت کا شکار ہو سکتا ہے۔

***

وطن عزیز کو آزادی کے ساتھ جمہوریت بھی نصیب ہوئی اور ساری دنیا میں یہی خوبی ملک کی سب سے بڑی شناخت بھی بنی۔ اس جمہوریت کے سفر میں کئی نشیب و فراز بھی آئے مگر جمہوریت والوں کا عقیدہ بہر حال اپنی جگہ رہا۔ البتہ گذشتہ پندرہ بیس سالوں سے ابلیس کی پرانی سرگوشی کے علی الاعلان اظہار میں موجودہ سیاست کو سازگار ماحول مل ہی گیا اور اب معاملہ یہ ہے کہ ابلیسی نظام کے سب سے بڑے ہتھیار یعنی جھوٹ کی گرم بازاری نے مکر و فریب کو موجودہ سیاست کی سب سے بڑی شناخت بنا دیا۔ اکثریت اور اقلیت کا جو فرق ترجیحات کے تعین کے لیے تھا وہ محض نفرت اور فاصلوں کے بڑھنے اور بڑھانے ہی کے لیے خاص ہو گیا۔ ملک میں معاشی اور معاشرتی طبقاتی تقسیم کو مذہبی رنگ دینے کا عمل ہزاروں سال سے ہوتا آیا ہے لیکن اس نہایت کریہہ اور انسانی تاریخ کے سب سے بڑے جرم پر پردہ ڈالنے کے لیے ملک کی مذہبی اقلیتوں سے نفرت اور ان کے ذہنی استحصال اور مذہبی استبداد کو ذریعہ بنانا ایسا جرم ہے جو خود ابلیس کی زبان میں کار ابلیسی ہے۔ جمہوری آمریت اور فسطائیت ہی ابلیسیت ہے جس کی زد میں ہونے کا احساس ہر اس قلب و ذہن کو ہے جس کے ضمیر میں حب وطن کا خمیر شامل ہے۔ کسی خاص طبقہ یا قوم کے مسائل کی فکر اور ان کا حل یقیناً اس طبقہ یا قوم کے لیے خاص اہمیت رکھتا ہے لیکن یہی مسائل اگر پورے ملک کی کمزوری اور بربادی اور عام انسانی معاشرتی زندگی کی کسی منفی شکل کا پتہ دینے لگیں تو یہ اکثریت اور اقلیت کی بحث سے اوپر ملک کی سالمیت اور اس کی حفاظت کے باب میں تشویش کا سبب بن سکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مختلف طبقوں اور اقلیتی قوموں کے علاوہ خود اکثریت کے صاحب فہم اور یقیناً درد مند حلقوں میں جمہوریت کو

ابلیسیت میں بدلنے کی منظم حرکتوں سے بے چینی ہے لیکن اس سے زیادہ ملک کی اقلیتوں خصوصاً مسلمانوں کے لیے جس طرح زمین اور زندگی تنگ کی جارہی ہے اس کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔ ملک میں غریبی، مہنگائی، بے روزگاری کم اہم نہیں لیکن سیاست کی اخلاقیات کی پامالی کا وہ منظر نہایت روح فرسا ہے جو مسلم اقلیت کے لیے تیار کیا گیا ہے۔ زبان، تہذیب، ثقافت، مساجد، مقابر، تاریخی آثار ایک سلسلہ ہے جو ختم ہونے کا نام نہیں لیتا۔ شہروں اور عمارتوں، بازاروں، محلوں اور سڑکوں کے نام بدلنے کے بعد اب مدرسوں کے جائزے کے عمل نے پوری اقلیت کو جس تحقیر کے احساس سے دوچار کیا شاید اس کے اثرات صدیوں تک زائل نہ ہوں اور اب تازہ ترین ستم وقف کی املاک کے جائزے کے نام سے ایجاد کیا گیا۔ جس کی نیت میں ایک ایسے وقف قانون کو نافذ کرنا ہے جس کی رو سے وقف بورڈ کسی بھی وقف جائداد پر قابض ہو سکتا ہے۔ ایک مسلم بزرگ رہنما نے تو کہہ دیا کہ اس سے زیادہ شیطانی، مکروہ، خباثت، جھوٹ کی بات نہیں کی جاسکتی کہ وزیر اعظم ان تمام وقف کی جائدادوں کو قانوناً کالعدم کردیں جو اورنگ زیب کے بنائے ہوئے وقف قانون کے مطابق ہیں۔ ستم گروں کے لیے تاریخ کی سچائیاں جس طرح بے معنی ہوئی ہیں چند برسوں پہلے تک اس کا تصور بھی محال تھا لیکن اقتدار اور دولت کا نشہ، تاریخ کی حقیقتوں پر کب نظر کرنے کی فرصت دیتا ہے۔ ملک کا وزیر داخلہ عموماً اعلیٰ تعلیم یافتہ سمجھا جاتا ہے لیکن بقول ایک مبصر ملک کے وزیر داخلہ جیسے سیاسی دانشوروں سے سیاسی تاریخ کی سمجھ کی توقع کرنا وقت کا ضیاع ہے۔ وزیر داخلہ کے علم تاریخ کا ایک اندازہ اس وقت ہوا جب سقوط حیدرآباد کی تمام سچائیوں کو بالائے طاق رکھ کر انہوں نے اس دن کو غلامی سے نجات اور آزادی کے حصول سے تعبیر کیا۔ انہوں نے سلطنت آصفیہ کے خاتمہ کو صدیوں کی غلامی سے آزاد ہونا بتایا۔ اب کیسے بتایا جائے کہ تمام معاہدوں اور ضابطوں کو درکنار کرتے ہوئے جو پولیس ایکشن ہوا وہ سلطنت کی فوجوں سے تصادم تھا یا صرف مسلم اقلیت کا قتل عام تھا جس کے چشم دید گواہ آج بھی موجود ہیں۔ ایک روایت کے مطابق پنڈت سندر لال حیدرآباد سے اورنگ آباد اور بیدر سے رائچور تک لاشیں گنتے گنتے عاجز ہو گئے تھے۔ یہ سب اسی ہندوستان کے شہری تھے جس میں حیدرآباد کی طرح اور بھی خود مختار ریاستیں تھیں۔ رضاکاروں کا ظلم وزیر داخلہ نے یاد دلایا مگر انہوں نے یہ بتانے کی ضرورت نہیں سمجھی کہ یہ رضاکار سلطنت آصفیہ کے وفادار تھے یا پھر اس کے مخالف تھے؟ اور پھر یہ سلطنت آصفیہ کیا پرتگالیوں کی طرح ہمیشہ غیر رہی یا پھر ایک فرانسیسی سیاح موسیو پرنوہال کی نظر میں ایسی ہندو اکثریت کی سلطنت تھی جو اطمینان اور مرفہ الحالی سے بہرہ ور تھی۔

دارالمصنّفین کی شائع کردہ کتاب ''یادوں کی دنیا'' میں ڈاکٹر یوسف حسین خاں نے لکھا کہ حیدرآباد میں ہندوستانی تہذیب کی یگانگت اور یکجہتی کے منظر اپنی جھلکیاں دکھاتے ہیں۔ یہ محبت صدیوں کے تاریخی عمل کا نتیجہ تھی۔ افسوس ہے کہ نہ اس کی اہمیت سمجھی گئی نہ اس کی قدر ہوئی۔ حیدرآباد کے حصے بخرے ہونے کے بعد وہ سب قدریں درہم برہم ہوگئیں جن کی پرورش اور نشو ونما اہل دکن کے صدیوں کے میل جول اور رہن سہن سے ہوتی تھی، یہ تاریخ کی ایک دین تھی۔ ڈاکٹر یوسف حسین نے صحیح کہا تھا کہ کوئی فرد یا قوم اپنے حکم یا خواہش سے تاریخ کی تخلیق نہیں کرسکتی، تاریخ تخلیق نہیں ہوا کرتی بلکہ قدرتی طور پر نشو و نما پاتی ہے۔ برسوں پہلے معارف کے صفحات نے گواہی دی تھی کہ دکن کی اس سلطنت کا رقبہ حکومت ضرور محدود ہے مگر اس کے انوار کرم سے پورے ملک کا ذرہ ذرہ روشن ہے۔ وہ ہندوستان کی امیدوں کا چراغ ہے۔ جس امن وامان عدل وانصاف اور ہندو مسلم کی باہم یکجہتی کے مناظر یہاں ہیں۔ اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ دہلی کی سلطنت نے ایسے کتنے دلفریب اور دلکش مناظر پیش کیے ہوں گے۔ حیدرآباد کی تاریخ کو جس نے ذرا بھی پڑھا ہے وہ جانتا ہے کہ نوابوں سے کہیں زیادہ ریاست کے راجاؤں کا دبدبہ تھا۔ مسلم فرماں رواؤں کے زیر سایہ ہندو راجاؤں کی حکمرانی یہ صرف مسلم حکمرانوں کی وطن دوستی ہی میں مل سکتی ہے لیکن محبت، انصاف، عدل، رعایا کی خبر گیری اور ان کی صحت وسلامتی کی ضمانت کی یہ مثالیں ان نظروں میں کیسے سما سکتی ہیں جن پر نفرت اور دشمنی کی دبیز اور تاریک تہوں کا بسیرا ہے۔ ایسے خاطئین کے لیے زیادہ افسوس نہیں کہ ان کا انجام بھی بہت دور نہیں۔ لیکن حسرت اور حیرت دونوں اس قوم کے انجام سے لرزہ براندام ہیں جو عزت نفس اور غیرت وحمیت کی روایات سے اپنی بے خبری اور بے حسی کا شعور کھوتی جارہی ہے جس نے اپنی زبان، اپنی تہذیب اور اپنی تاریخ سے غفلت کو اپنا شعار بنالیا اور سب سے بڑھ کر یہ المیہ کہ جو بحیثیت قوم ستاروں کو راہ دکھانے کی صلاحیتوں سے نوازے گئے وہ اپنے مرد راہ داں کے لیے ترستے نظر آتے ہیں۔ مرد راہ داں تو اسی وقت نظر آئیں گے جب پوری قوم اپنی قومیت کے عناصر کی پوری طرح حفاظت کرے گی۔ اس کے لیے کامل جدوجہد کرے گی اور اس راہ میں جانی ومالی خدمت وایثار کے جذبات سے اپنی خود مختاری کا ثبوت دے گی۔ ابھی بظاہر یہ تمنائے خام ہے لیکن عزم وعقیدہ پختہ ہو تو واللہ یؤتی ملکہ من یشاء کی تعبیر میں شک بھی نہیں۔

***

افسوس گذشتہ دنوں ملک وملت کو کئی صدمے پہنچے۔ مولانا جلال الدین عمری سابق امیر جماعت

اسلامی ہند نے وفات پائی۔ ان کے بعد جناب بی، شیخ علی بھی حیات مستعار کا حق ادا کر کے رخصت ہوئے۔ وہ گوا اور منگلور یونیورسٹیوں کے وائس چانسلر رہے۔ بنگلور کے مشہور اخبار سالار کی ادارت بھی کی۔ تاریخ ان کا خاص موضوع تھا۔ علمی دنیا میں بڑی وقعت تھی۔ ان کی خدمات کے جائزہ کی ضرورت ہے۔ دیوبند کے مشہور خانوادہ انوری کی روایات کے وارث مولانا نسیم اختر شاہ قیصر نے اس دنیائے فانی کو الوداع کہہ دیا۔ وہ دارالعلوم وقف کے استاد تھے۔ تعلیم کے ساتھ علم و ادب میں بھی ایک شان رکھتے تھے۔ دیوبند کے علمی و دینی آسمان میں ادب و انشا کے خاص ستاروں میں ان کا شمار تھا۔ اخلاق و شرافت سے ان کی شخصیت میں خاص کشش تھی۔ یہ سارے صدمے ابھی تازہ ہی تھے کہ ڈاکٹر اصغر عباس کے انتقال کی خبر ملی۔ ان کی مرتب کردہ کتاب ''شذرات سرسید'' دارالمصنفین سے ان کے تعلق کی گواہ ہے۔ اللہ تعالیٰ ان مرحومین کو اپنے جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائے۔ آمین

***

امریکہ میں مقیم محترمہ حمیدہ بانو قارئین کے لیے محتاج تعارف نہیں۔ رسالہ معارف کے لیے ان کے عطیہ حمیدیہ کا ذکر آچکا ہے۔ اب ان کی فیاضی نے سیرت النبیؐ کی نئی طباعت و اشاعت کے لیے ایک خطیر رقم عنایت کی ہے۔ سیرت سے محبت، پیام سیرت کی اشاعت کے جذبے اور علامہ شبلی اور ان کے ادارے سے یہ تعلق رضائے الٰہی کے لیے ہے۔ اللہ تعالیٰ حسن قبول سے نوازے۔

مقالات

مولانا حبیب الرحمن قاسمی اعظمی مرحوم کی علمی یادگار: تذکرۂ علماءِ اعظم گڑھ

پروفیسر ظفر الاسلام اصلاحی

zafarul.islam@gmail.com

دیارِ پورب کے ممتاز عالمِ دین، دار العلوم دیوبند کے نامور استاد، ماہرِ علمِ حدیث اور مصنفِ شہیر مولانا حبیب الرحمن اعظمی مرحوم (م: ۱۳۰ مئی ۲۰۲۱ء) کی مطبوعہ علمی یادگاروں میں ۳۵ سے زائد کتب اور سیکڑوں مقالات کا ذکر ملتا ہے۔ ان کی بیشتر تصانیف علمِ حدیث و محدثین، فقہی مسائل، دینی و علمی شخصیات کے تذکرے، آثارِ قدیمہ اور حالاتِ حاضرہ کے مسائل سے تعلق رکھتی ہیں۔ ان سب کی قدر و قیمت و افادیت اپنی جگہ مسلم ہے۔ اس ضمن میں ماہنامہ دار العلوم دیوبند کی خصوصی اشاعت ۱۰۵/۸، اگست ۲۰۲۱ء اور ماہنامہ ''الماس'' (ممبئی) کی خصوصی پیش کش، ۱/۴، ستمبر ۲۰۲۱ء ''مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی۔ حیات و خدمات'' کا مطالعہ مفید ہوگا۔

مرحوم کی تصانیف پر نظر ڈالنے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ انہیں تاریخ و تذکرہ کا خاص ذوق تھا۔ ''تذکرہ علماءِ اعظم گڑھ'' کے علاوہ ان کی یہ نگارشات بھی اس کی شہادت دے رہی ہیں: شیوخ الامام ابی داؤد السجستانی فی کتاب السنن (عربی)، امام ابو حنیفہ کا علمِ حدیث میں مقام و مرتبہ، امام ابو حنیفہ کے حالات، شجرۂ طیّبہ (تذکرہ مولانا شاہ محمد طیب بنارسی)، کاروانِ دیوبند کے تذکرے، اجودھیا کے اسلامی آثار، ماہنامہ دار العلوم دیوبند وفیات نمبر (۵۲ شخصیات پر مضامین)، دیارِ پورب (جونپور، بنارس وغیرہ) کے علماء و فضلاء پر متعدد مضامین[1]۔ ناچیز کی رائے میں مولانا مرحوم کی علمی یادگاروں میں ''تذکرہ علماءِ اعظم گڑھ'' خصوصی اہمیت کی حامل ہے۔ یہ تالیف اپنے موضوع پر اولین وقیع کاوش ہے

۱۔ تذکرہ نگاری کے میدان میں مولانا مرحوم کی خدمات پر مفید معلومات کے لئے ملاحظہ فرمائیں: شرف الدین عظیم قاسمی الاعظمی، ''مولانا حبیب الرحمن اعظمیؒ بحیثیت تذکرہ نگار''، ماہنامہ الماس (ممبئی) کی خصوصی پیش کش مولانا حبیب الرحمن اعظمیؒ۔ حیات و خدمات، ادارۂ فکر و فن، گوونڈی، ممبئی، ۲۰۲۱ء، ص ۳۵۵۔۳۶۸

اور اسے بلاشبہ مرجع کی حیثیت حاصل ہے۔ پہلی بار یہ کتاب جامعہ اسلامیہ، بنارس سے ۱۹۷۶ء میں طبع ہوئی تھی۔ اس کا دوسرا ایڈیشن مرکزِ دعوت و تحقیق، دیوبند سے ۲۰۱۲ میں (مع ترمیم واضافہ) شائع ہوا۔

ہندوستان میں علماء ومشائخ کا تذکرہ مرتب کرنے کی روایت قدیم ہے۔ اس ملک میں فارسی تذکرہ نگاری کا سلسلہ عہد سلطنت (۱۲۰۶۔۱۵۲۶ء) میں شروع ہوا اور مغل بادشاہت (۱۵۲۶ء-۱۸۵۷ء) کے خاتمہ کے بعد بھی جاری رہا۔ عہدِ مغلیہ میں مولفہ کچھ اہم تذکرے یہ ہیں: منتخب التواریخ (عبدالقادر بدایونی) (جلد سوم)، اخبار الاخیار (شیخ عبدالحق محدث دہلوی)، سیر الاولیاء (میر خورد کرمانی)، مآثر رحیمی (عبدالباقی نہاوندی) (جلد سوم)، طبقاتِ شاہجہانی (محمد صادق ہمدانی)، گلزارِ ابرار (محمد غوثی شطاری)، سکینۃ الاولیاء (داراشکوہ)، انفاس العارفین (شاہ ولی اللہ دہلوی)، سبحہ المرجان فی آثار ہندوستان (عربی) (غلام علی آزاد بلگرامی)، مآثر الکرام (غلام علی آزاد بلگرامی) اور بحرِ زخّار (شیخ وجیہ الدین اشرف لکھنوی) وغیرہ۔

اردو تذکرے بھی فنی وادبی لحاظ سے اپنی اہمیت رکھتے ہیں۔ اردو میں تذکرہ نگاری کی روایت بھی قدیم ہے۔ اس کا آغاز اٹھارہویں صدی عیسوی کے آخر سے منسوب کیا جاتا ہے۔ خاص علماء کے تذکرے پر اولین اردو کتاب کی حیثیت سے ''تطییب الاخوان بذکر علماء الزماں ملقب بہ تذکرہ علمائے حال'' (مولفہ مولانا محمد ادریس نگرامیؒ م: ۱۹۱۲ء) معروف ہے۔ یہ پہلی بار ۱۸۹۷ء میں طبع ہوئی (اس قدیم تذکرہ کو دوبارہ پروگریسو بکس، لاہور نے پروفیسر اقبال مجددی مرحوم کی تحقیق وتعلیق کے ساتھ بڑے اہتمام سے ۲۰۱۷ء میں شائع کیا ہے)۔ یہ تذکرہ ہندوستان کے معروف علماء کے احوال وکوائف پر مشتمل ہے اور اس سے متعلق ایک اور اہم بات یہ کہ علامہ شبلی نعمانیؒ نے اس کی تالیف کے ارادے کو پسند فرماتے ہوئے یہ تاثر ظاہر کیا تھا: ''نہایت عمدہ تجویز ہے، مجھ کو مدت سے خیال تھا''[۲]۔ ''حیاتِ شبلی'' کے مصنفِ مولانا سید سلیمان ندویؒ نے اس کے بارے میں یہ صراحت کی ہے کہ ''یہ ۱۸۹۷ء میں مولانا (شبلی) کے علم اور مشورے سے لکھا گیا''[۳]۔

۲۔ محمد ادریس نگرامی، تطییب الاخوان بذکر علماء الزماں ملقب بہ تذکرہ علمائے حال، نول کشور، لکھنؤ، ۱۸۹۷ء، ص ۴

۳۔ سید سلیمان ندوی، حیات شبلی، دار المصنّفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ، ۲۰۱۵ء، ص ۱۳۲

بعد میں اردو تذکرہ نگاری کا سلسلہ آگے بڑھتا رہا اوراس کا دائرہ بھی وسیع ہوتا رہا۔ برِّ صغیر کے حوالے سے بعد کے دور میں علماء و مشائخ کی حیات و خدمات پر جو کتابیں زیرِ مطالعہ کتاب کے طبع اول (۱۹۷۶ء) سے قبل تالیف کی گئیں ان میں سے کچھ اہم عربی، فارسی و اردو تالیفات یہ ہیں: تذکرۃ المشائخ (رفیع الدین مرادآبادی م: ۱۸۰۴ء)، تذکرہ علماءِ ہند (فارسی) (رحمان علی م: ۱۹۰۷ء)، تذکرہ علمائے ہندوستان (سید محمد حسین بدایونی م: ۱۹۱۸ء)، تذکرہ علماء (محمد حسین آزاد م: ۱۹۲۲ء)، حیٰوۃ العلماء (تذکرہ علمائے سہسوان) (عبد الباقی سہسوانی م: ۱۹۳۶ء) (طبع اول ۱۹۲۲ء)، نزہۃ الخواطر (۸ جلدیں) (سید عبد الحہ الحسنی م: ۱۹۲۳ء)، تذکرہ شمس العلماء مولانا شبلی مرحوم (محمد مہدی بھوپالی) (طبع اول ۱۹۲۵ء)، آثار الاول من علماء فرنگی محل (عربی) (قیام الدین عبد الباری فرنگی محلی م: ۱۹۲۶ء)، تذکرہ مشاہیرِ کاکوری (محمد علی حیدر م: ۱۹۴۷ء) (طبع اول ۱۹۲۷ء)، تذکرہ کاملانِ رام پور (احمد علی خاں شوق رام پوری م: ۱۹۳۳ء) (طبع اول ۱۹۲۹ء)، تراجم علماءِ حدیث (ابو یحیٰ امام خاں نوشہروی م: ۱۹۶۶ء) (طبع اول ۱۹۳۸ء)، اذکار الابرار (شاہ تقی حیدر قلندر م: ۱۹۴۰ء) (طبع اول ۱۹۳۸ء)، تذکرہ علمائے فرنگی محل (محمد عنایت اللہ انصاری فرنگی محلی م: ۱۹۴۱ء)، علمائے حق (محمد میاں) (طبع اول ۱۹۴۷ء)، تذکرہ مشائخِ بنارس (عبد السلام نعمانی) (طبع اول ۱۹۵۱ء)، رجال السند والھند (عربی) (قاضی اطہر مبارک پوری م: ۱۹۶۶ء) (طبع اول ۱۹۵۸ء)، تذکرہ مشائخِ دیوبند (عزیز الرحمن بجنوری) (طبع اول ۱۹۵۹ء)، تذکرہ علماء مبارک پور (قاضی اطہر مبارک پوری) (طبع اول ۱۹۷۴ء)، فقہائے ہند (محمد اسحاق بھٹّی م: ۲۰۱۵ء) (طبع اول ۱۹۷۴ء)۔

اوپر کے تذکرہ جات پر نظر ڈالنے سے یہ واضح ہوتا ہے کہ کسی مصنف نے پورے ملک کے علماء کو موضوع بنایا تو کسی نے کسی خاص علاقہ، خطہ، کسی ضلع یا مقام کے علماء پر معلومات فراہم کیں اور بعض نے کسی مخصوص مسلک یا مکتبِ فکر کے علماء و فضلاء پر اپنی تالیفی کاوش پیش کی۔ بعض اصحابِ قلم نے صرف ایک ہی عالم کو اپنے تذکرے کا موضوع بنایا۔ اسی طرح سلسلہ وار ایک ایک صدی کے علماء کے احوال و کوائف پر بھی کتابیں تالیف ہوئیں۔ بایں طور مختلف نوعیت کی کتبِ تذکرہ کی اشاعت کا سلسلہ جاری رہا۔ زیرِ مطالعہ کتاب، جیسا کہ نام سے واضح ہے، مختلف اعتبار سے اہمیت و شہرت کے حامل ضلع اعظم گڑھ کے علماء کے تذکرے سے تعلق رکھتی ہے۔

''تذکرہ علماءِ اعظم گڑھ'' کی تالیف کی تحریک پیدا کرنے میں دیارِ پورب کے دو ممتاز علماء و محققین (قاضی اطہر مبارک پوریؒ اور مولانا حبیب الرحمٰن محدث اعظمیؒ) کا اہم کردار رہا ہے۔''

چراغ سے چراغ جلتا ہے''، یہ مثل علم کی نسبت سے بھی صادق آتی ہے۔ خانقاہ رشیدیہ جونپور کے کتب خانہ میں ''گنجِ ارشدی'' (ملفوظات شیخ ارشد جونپوری) سے بانیِ مبارک پور سید راجہ مبارک کے حالات نقل کرتے ہوئے قاضی اطہر مبارک پوریؒ نے زیرِ مطالعہ کتاب کے مصنف کے علمی ذوق وشوق کا مشاہدہ کیا تو انہیں دیارِ مشرق کے علماء کے حالات پر مطالعہ و تحقیق و تصنیف کی رغبت دلائی۔ یہ ترغیب اس لحاظ سے بار آور ثابت ہوئی کہ انہوں نے دیارِ پورب بالخصوص جونپور کے علماء پر متعدد مضامین لکھے جو مختلف معروف اردو رسائل (بشمول معارف و برہان) میں شائع ہوئے۔ کچھ عرصہ بعد انہیں یہ احساس ہوا کہ ضلع اعظم گڑھ بڑا مردم خیز خطّہ رہا ہے اور اس کے مختلف علاقوں میں بہت سے دینی تربیت گاہیں اور علمی مراکز سر گرمِ عمل رہے ہیں۔ مزید یہ کہ اس خطہ میں بہت سے نامور علماء گزرے ہیں جن کی دینی و علمی خدمات آج بھی بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہیں، کیوں نہ ان کے حالات و کارناموں پر مشتمل ایک کتاب تیار کی جائے۔ اعظم گڑھ کے بارے میں مولانا کا جو احساس اس کتاب کی تالیف کے لیے محرک بنا، اسے انہی کے الفاظ میں ملاحظہ فرمائیں:

> اتّر پردیش کے اضلاع میں ضلع اعظم گڑھ اپنی زرخیزی اور شادابی میں ایک نمایاں مقام رکھتا ہے۔ اس خطّہ ارض سے ایسے ایسے باکمال افراد ابھرے، جن کے کارناموں پر ملتِ اسلامیہ ہمیشہ فخر کرتی رہے گی، لیکن یہ عجب بات ہے کہ یہ ضلع جس قدر مردم خیز ہے اسی قدر مسلمان مورخوں اور تذکرہ نویسوں نے اس سے غفلت اور بے اعتنائی برتی ہے۔ اسی لیے یہاں کی علمی و دینی تاریخ پر ناواقفیت کا ایک دبیز پردہ پڑا ہوا ہے اور یہاں کی بہت سی ایسی شخصیتیں جو اپنے علمی و روحانی کمالات کی بنا پر اس کی مستحق تھیں کہ ان پر مستقل کتابیں تالیف کی جاتیں، اس طرح گوشہ گمنامی میں کھو گئیں کہ ان کے ناموں کے سوا آج ان کے بارے میں کچھ بھی معلوم نہیں[۴]۔

واقعہ یہ کہ اعظم گڑھ کی علمی زرخیزی پر خود مولانا کا مولد و مسکن (موضع جگدیش پور) بھی شاہد ہے کہ قصبہ پھول پور سے متصل اس معمولی گاؤں نے دارالعلوم دیوبند کو علم و فن کے تین لعل و گہر (دارالعلوم کے سابق شیخ الحدیث و ممتاز استاد مولانا عبدالحقؒ، ماہر علم حدیث، متعدد کتب کے مصنف اور تقریباً ۳۳ برس ماہنامہ دارالعلوم کے منصبِ ادارت پر فائز مولانا حبیب الرحمٰن اعظمیؒ اور شیخ القراء اور علمِ تجوید و قراءت پر پچاس سے زائد کتابوں کے مصنف مولانا قاری ابوالحسن اعظمی) عطا کیے۔

۴۔ حبیب الرحمن اعظمی، تذکرہ علماءِ اعظم گڑھ، جامعہ اسلامیہ، بنارس، ۱۹۷۶ء (طبع اول / پیش لفظ)، ص ۲۹؛ طبع ثانی، مرکزِ دعوۃ و تحقیق، دیوبند، ۲۰۱۲ء، ص ۳۸

اسی دوران مولانا کی ملاقات مولانا قاضی اطہر مبارک پوری سے ہوئی اور اپنا ارادہ ظاہر کیا تو انہوں نے اس علمی کام کی شدید ضرورت سے نہ صرف اتفاق کیا، بلکہ یہ بھی فرمایا کہ وہ خود یہ کام کرنا چاہ رہے تھے اور اس کا آغاز بھی کردیا تھا، لیکن ہجومِ کار کی وجہ سے آگے نہ بڑھ سکا، کیا ہی اچھا ہوگا کہ تم ہی اس کام کو کر ڈالو، اس سے متعلق میرے پاس جو کچھ مواد ہے تمھارے حوالے کردوں گا۔ قاضی صاحب کی ان باتوں کو مولانا نے ''تاکیدی حکم'' خیال کیا اور اس نہج پر ایک کتاب تالیف کرنے کا عزم کرلیا اور اللہ کا نام لے کر اس میدان میں اتر پڑے[۵]، اور بالآخر ان کی جدوجہد، جاں فشانی و عرق ریزی ''تذکرہ علماء اعظم گڑھ''، جیسی وقیع و نہایت مفید تالیف میں منتج ہوئی۔ یہاں یہ واضح رہے کہ نامور محدث مولانا حبیب الرحمن اعظمیؒ نے بھی اپنے ضلع کے علماء کی بیش بہا دینی و علمی خدمات کو محسوس کرکے اس موضوع پر لکھنا شروع کیا تھا، لیکن بعض مصروفیات کی وجہ سے یہ کام مکمل نہ ہوسکا اور جو کچھ تحریر کیا تھا اس کا مسوّدہ بھی کہیں اِدھر اُدھر ہوگیا اور تلاش کے باوجود نہ مل سکا۔ بعد میں جب اسی موضوع پر مولانا کی کاوش کو دیکھا تو فرمایا: ''مولانا حبیب الرحمن جگدیش پوری ہم سب کی طرف سے شکریہ اور مبارک باد کے مستحق ہیں کہ انہوں نے ''تذکرہ علماء اعظم گڑھ'' لکھ کر ہم سب کو اس قرض سے سبک دوش کردیا۔ مولانا حبیب الرحمن صاحب کی یہ تالیف دیکھ کر مجھے اپنے مسودہ کے نہ ملنے کا کچھ زیادہ غم نہیں ہے''[۶]۔ حقیقت یہ کہ مصنفِ گرامی کا ذوقِ تذکرہ نگاری، تحقیق و جستجو کا شوق اور اپنے دیار کے علماء کی دینی و علمی خدمات اجاگر کرنے اور علم و فن کے میدان میں اپنے ضلع کا نام روشن کرنے کا حوصلہ تھا جس نے مختلف قسم کی دشواریوں کے باوجود اس کتاب کی تالیف کی راہیں ہموار کیں۔

کتاب کے لیے معلومات جمع کرنے میں مصنفِ گرامی کو بہت سی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا۔ سب سے بڑی دشواری یہ تھی کہ بہت سی ایسی شخصیات تھیں جن کے ذاتی احوال اور ان کی علمی و دینی خدمات سے متعلق کوئی تحریری مواد دستیاب نہ تھا۔ دوسرے یہ بھی پیشِ نظر رہے کہ کتاب کی تالیف کے زمانہ میں دیہی علاقوں میں آمد و رفت کی مناسب سہولیات نہیں تھیں، بلکہ نہ ہونے کے برابر تھیں۔ ان سب کے باوجود مصنفِ گرامی نے نہ معلوم کتنے قریات و قصبات کی خاک چھانی۔

۵۔ تذکرہ علماءِ اعظم گڑھ، (طبع اول، پیش لفظ)، ص۲۹؛ طبع ثانی، ص۳۸-۳۹

۶۔ تذکرہ علماء اعظم گڑھ، (طبع اول)، ص ۲-۳؛ طبع ثانی، ص ۲۰

دیہی و شہری علاقے میں بہت سے لوگوں کے گھروں پر انہیں بار بار دستک دینی پڑی، کیونکہ ضروری نہیں کہ پہلی ہی حاضری پر صاحب تذکرہ کے گھر والوں، اعزّہ یا عام واقف کاروں سے ملاقات ہو گئی ہو۔ اسی طرح قبرستان و مزارات میں کتبات کی تلاش اور انہیں پڑھنے میں جو دقتیں پیش آئیں وہ بھی کچھ کم نہ تھیں۔ کتاب کے لیے مطلوبہ معلومات جمع کرنے میں مصنفِ محترم کو جن دِقّتوں و دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا ان کی تھوڑی سی جھلک طبع اول کے پیش لفظ میں ان کے اس بیان میں ملاحظہ فرمائیں:

> آغاز میں کام کو جتنا آسان سمجھا تھا معاملہ اس کے بالکل برعکس نکلا اور اندازہ ہوا کہ محض کتابوں کی ورق گردانی سے اس سے عہدہ برآ ہونا ممکن نہیں، اس لیے شب و روز کی قید سے آزاد ہو کر آبادیوں اور ویرانوں کا چکر لگانا شروع کیا، بزرگوں کے مزارات کو قریب سے جا کر دیکھا، کتبات اور قلمی دستاویزات کی چھان بین کی، ثقہ اور قابل اعتماد لوگوں سے مل کر معلومات حاصل کی اور دور و نزدیک جہاں سے مطلب کی بات ملنے کی ہوئی، وہاں جانے سے دریغ نہیں کیا۔ اس طرح مسلسل تین سال کی جد وجہد کے بعد جو معلومات فراہم ہو سکیں اسے بغیر کسی خیانت یا دانستہ تقصیر کے ایک غیر جانبدار تذکرہ نویس کی حیثیت سے مآخذ و مصادر کے حوالے کے ساتھ جمع کر دیا[۷]۔

کتاب کی تکمیل کے بعد اس کی طباعت کا مسئلہ در پیش تھا۔ مسبب الاسباب اللہ رب العزت نے اس کے حل کی جو صورت پیدا فرمائی، اس میں بھی بڑی عبرت کا سامان ہے۔ اسے خود مصنفِ محترم کے الفاظ میں ملاحظہ فرمائیں: ''آگے کا مرحلہ اس کے چھپنے کا تھا، جس کی خدائے کارساز نے یہ صورت پیدا کر دی کہ ''جامعہ اسلامیہ بنارس'' (جہاں یہ خاکسار مدرس تھا) کے ذمہ دار اس کی طباعت پر بایں شرط راضی ہو گئے کہ اس پر جس قدر رقم خرچ ہو گی بعد میں تمہاری تنخواہ سے بالاقساط وضع کر لی جائے گی''[۸]۔

بہر حال تمام مراحل سے گذر کر کتاب پہلی بار ۱۹۷۶ء میں زیورِ طبع سے آراستہ ہوئی اور اللہ کا فضل و کرم کہ اسے مقبولیت نصیب ہوئی اور ہاتھوں ہاتھ لی گئی، یعنی مصنف گرامی کو اپنی جانفشانی اور انتھک کوششوں کا صلہ مل گیا۔ ہند و پاک کے ممتاز اہلِ قلم واصحابِ ذوق نے اپنے تاثرات و تبصروں میں کتاب کی قدر و قیمت اجاگر کی اور اس وقیع علمی خدمت پر مصنفِ محترم کو ہدیۂ تبریک پیش کیا۔ علی گڑھ کی نسبت سے یہ ذکر بر محل معلوم ہوتا ہے کہ ممتاز محقق و شاعر اور استاد شعبۂ اردو،

۷۔ حبیب الرحمن قاسمی، تذکرہ علماءِ اعظم گڑھ (طبع اول)، محولہ بالا، ص ۲۹۔۳۰

۸۔ تذکرہ علماءِ اعظم گڑھ، (پیش لفظ طبع ثانی)، ص ۴۲

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمیؒ نے بھی اس کتاب پر اپنے مفصل تاثرات ارسال کیے تھے۔ طبعِ ثانی کے مقدمے میں مصنف گرامی نے اس کا خصوصی ذکر ان الفاظ میں کیا: ''ڈاکٹر خلیل الرحمن اعظمی نے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے چار صفحات پر مشتمل مکتوب بھیجا اور بڑے والہانہ انداز میں اس پر دادِ تحسین دی، اور از راہِ نوازش ملاقات کی خواہش کا بھی اظہار کیا، مزید برآں تراجم وتذکرے سے متعلق بعض مفید واہم مشورے سے بھی نوازا جن کو جدید ایڈیشن میں حتّی الوسع ملحوظ رکھا گیا ہے''[9]۔

بہر حال کچھ ہی مہینے بعد یہ کتاب آوٹ آف اسٹاک ہوگئی۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ توّے کی دہائی میں ادارہ علوم القرآن، علی گڑھ کی خدمت انجام دیتے ہوئے جب میں نے ادارے کی لائبریری میں اسے دستیاب کرانا چاہا تو بنارس سے اس کی فوٹو کاپی منگوانی پڑی اور پھر اسے مجلد کرا کے شائقینِ علم و محققین کے استفادے کے لیے لائبریری میں محفوظ کرادیا۔ در حقیقت مولانا مرحوم سے اس ناچیز کا اولین رابطہ اسی کتاب کی نسبت سے ہوا۔ جب بھی فون پر اُن سے بات ہوتی تو اس کے طبعِ ثانی کی طلب ظاہر کرتا، اپنی جانب سے اور دوسرے قدر دانوں کی جانب سے بھی۔ ایک دفعہ موسمِ گرما کی تعطیل کے دوران میں اپنے گاؤں (چھتے پور) میں تھا تو معلوم ہوا کہ مولانا بھی اس وقت اپنے گاؤں (جگدیش پور) میں گھر پر سکونت پذیر ہیں۔ ملاقات کے لئے حاضرِ خدمت ہوا، بڑی اپنائیت سے ملے، کافی دیر تک ہم کلامی کا شرف نصیب ہوا۔ اس ملاقات میں بھی اپنی طلب کا اعادہ کیا، جواب میں یہی فرمایا کہ اس پر نظرِ ثانی اور مواد میں کچھ اضافہ درکار ہے، اس کے بعد ہی دوبارہ اس کی طباعت کا مرحلہ انجام پذیر ہوگا۔ آخر کار نہ صرف میری، بلکہ بہتوں کی دیرینہ طلب پوری ہوئی اور ۲۰۱۲ء میں کتاب کا دوسرا ایڈیشن منظرِ عام پر آگیا۔

جہاں تک زیرِ مطالعہ کتاب کے مصادر و مآخذ کا سوال ہے انہیں بنیادی طور پر پانچ حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے: (۱) اصحابِ تذکرہ کی اپنی مصنفہ و مرتبہ کتب و دیگر نگارشات، (۲) قلمی یاداشتیں، روزنامچے، بیاض، مدارس کے ریکارڈ رجسٹر، (۳) زیرِ تذکرہ علماء پر کتب و مضامین، (۳) صاحبِ تذکرہ کے اہلِ خانہ واقرباء و متعلقین کی زبانی روایات، (۴) صاحب تذکرہ کے اہلِ قریہ، قصبہ، شہر کے بیانات، (۵) بزرگوں کے مزارات اور عام قبرستان کے کتبے۔ بلاشبہ مراجع کی حیثیت سے وہ

۹۔ ماخذ سابق، ص ۴۲۔۴۳

مضامین زیادہ اہمیت کے حامل ہیں جو زیرِ تذکرہ علماء کے گھر والوں یا قریبی اعزّہ کے تحریر کردہ ہیں۔ کتاب میں مختلف مقامات پر اصحاب تذکرہ کے بیٹوں، پوتوں، نواسوں، بھائیوں، بھتیجوں وغیرہم کی تحریروں کے حوالے ملتے ہیں۔ معلومات جمع کرنے میں سب سے زیادہ مشکلات تیسری، چوتھی و پانچویں قسم کے مآخذ کے سلسلہ میں پیش آئیں اور انہی ذرائع سے معلومات اکٹھا کرنے میں زیادہ وقت بھی صرف ہوا۔ دشواری یہ تھی کہ ان کا استعمال بھی ناگزیر تھا کیونکہ بہت سے علماء کے بارے میں معلومات کے یہی خاص ذرائع تھے۔

طبعِ ثانی کے مشتملات میں مختلف اعتبار سے اضافے کیے گئے ہیں اور اس میں مختلف نوعیت کی ترمیمات و تبدیلیاں بھی ملتی ہیں۔ مصنف محترم نے جو کچھ اضافہ فرمایا ہے اسے پیش لفظ میں اس طور پر واضح کیا ہے:

> بالآخر ۳۶/۳۷ سالوں کے بعد قضا و قدر کے فیصلے کے مطابق اب یہ نقشِ ثانی اپنے قدر دانوں کے ہاتھوں میں پہنچ رہا ہے۔ اس میں ۶۰ سے زائد علماء و مشائخ کے حالات و خدمات کا اضافہ ہے، نیز بعض علماء کے تذکرے میں بھی کچھ باتیں زیادہ کی گئی ہیں۔ علاوہ ازیں تقریباً ۲۴ صفحات کا مقدمہ بعنوان ''خطۂ اعظم گڑھ کی مختصر تاریخ'' کا بھی اضافہ ہے۔ بہر حال مقدور بھر کتاب کو مفید سے مفید تر بنانے کی اپنی جیسی کوشش سے دریغ نہیں کیا گیا ہے۔ اس میں مولف کہاں تک کامیاب ہے، اس کا فیصلہ آپ کی فکر و نظر کے حوالے ہے۔ وماتوفیقی الّا باللہ [۱۰]۔

طبعِ ثانی میں مولانا محترم نے جو کچھ اضافہ فرمایا اس میں سب سے پہلے مذکورہ بالا اضافہ (خطۂ اعظم گڑھ کی مختصر تاریخ) کا ذکر مناسب معلوم ہوتا ہے، جو تقریباً پچاس صفحات پر مشتمل ہے۔ یہ اضافہ شدہ حصہ خطۂ اعظم گڑھ کے بارے میں مفید معلومات سے بھرپور ہے، اس کی کچھ وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے۔ اس میں جو امور زیرِ بحث آئے ہیں وہ یہ ہیں: اعظم گڑھ کی قدیم و جدید جغرافیائی حد بندی، خطے کے قدیم باسیوں اور سادھو سنتوں کا ذکر، قدیم راجگان اور ان کے مرکزی مقامات، ''اعظم گڑھ'' کے بانی اور ان کے خاندانی حالات، خاندان کے ممتاز افراد اور ان کا شجرۂ نسب، خطہ اعظم گڑھ میں نورِ اسلام پہنچنے اور پھیلنے کے واقعات، اِس خطے کے اولین داعیانِ اسلام، سالار مسعود غازیؒ شہید کی مجاہدانہ سرگرمیاں، اعظم گڑھ علاقے میں سلطان شہاب الدین غوری کی فتوحات،

۱۰۔ تذکرہ علماءِ اعظم گڑھ (پیش لفظ طبع ثانی)، ص ۴۳

سلطان قطب الدین کی سربراہی میں دہلی سلطنت کا قیام اور خطۂ اعظم گڑھ کے دینی و علمی ماحول پر اس کے اثرات، سلاطینِ دہلی اور جون پور کے شرقی سلاطین کے عہد میں اس علاقے میں تبلیغی و علمی سرگرمیاں، دین کی اشاعت اور علم کے فروغ میں نمایاں خدمات انجام دینے والی معروف شخصیات اور ان کے خاندان کا تذکرہ، خطۂ اعظم گڑھ میں علم و فن کے مشہور مراکز اور دینی تعلیم کے قدیم اداروں کا تعارف اور اس پہلو سے قدیم قصبات وقریات میں بالخصوص چریّا کوٹ، محمد آباد گہنہ، بھیرہ، بہاء الدین پور، خیر الدین پور، ماہل، نظام آباد، دیوگام، سرائے میر، مبارک پور، نیگو اور برونہ کی خدمات کا جائزہ (بیشتر مقامات کی وجہِ تسمیہ کی وضاحت کے ساتھ)۔ مفید معلومات سے بھرپور اس حصے کے لیے مواد کی فراہمی میں مصنفِ گرامی کے ماخذ میں خاص طور سے اس نوع کی کتب شامل رہی ہیں: تاریخی کتب، علماء وصوفیاء کے تذکرے، تاریخِ اعظم گڑھ (مولفہ شاہ افضال اللہ قادری)، ڈسٹرکٹ گزیٹیر (اعظم گڑھ)۔ جدید دور کی اردو کتب میں بالخصوص "حیاتِ شبلی" (مولفہ مولانا سید سلیمان ندویؒ) سے بہت سی مفید معلومات ماخوذ ہیں۔ اِن ذرائعِ معلومات پر نظر ڈالنے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اعظم گڑھ کی تاریخ سے متعلق معلومات جمع کرنے میں مولانا نے بڑی عرق ریزی و محنت کا مظاہرہ کیا۔ جن ماخذ ذرائع سے بھی متعلقہ معلومات ملنے کی امید تھی ان تک رسائی کی پوری کوشش کی اور بڑے، چھوٹے کے امتیاز کے بغیر ہر صاحبِ معلومات کے زبانی و تحریری مواد سے استفادہ کیا[۱۱]۔

طبع ثانی کے مشتملات میں دوسرا اہم اضافہ کتاب کے آخر میں "تکملہ" کے عنوان سے ہے جس کے تحت ۴۸ علماء کے تذکرے کا اضافہ کیا گیا ہے اور اس حصے کی ترتیب میں بھی حروف تہجی کی رعایت ملحوظ رکھی ہے۔ اس کے علاوہ بھی متن میں اضافے ملتے ہیں، اس کی کچھ تفصیل یہ ہے: مصنفِ گرامی کے مذکورہ بیان سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ طبع ثانی میں ۶۰ سے زائد علماء و مشائخ کے تذکرے کا اضافہ ہے۔ اسی طرح ماہنامہ دارالعلوم دیوبند اور ماہنامہ الماس (ممبئی) کی مولانا مرحوم پر خصوصی اشاعتوں میں بعض مضمون نگار حضرات نے اپنے مضمون میں یہ تحریر کیا ہے کہ "دوسرا ایڈیشن ۲۰۱۲ء میں شائع ہوا، اس میں ۶۰ سے زائد مشائخ کا اضافہ کیا گیا ہے"۔ بعض حضرات نے یہ ذکر کیا ہے کہ "دوسرے ایڈیشن میں مزید پچاس علماء کے حالات کا اضافہ کیا"۔ بعض اہلِ قلم کے

۱۱۔ تذکرہ علماء اعظم گڑھ، ص ۴۳۔۶۸، ۴۴۔۶۹

یہاں اضافہ کا ذکر اس طور پر ملتا ہے کہ ''طبع اول کے چھتّیس برسوں بعد ۲۰۱۲ء میں کتاب کا نقش ثانی سامنے آیا جس میں تقریباً پچاس اعظمی شخصیات اور دس سے زائد حاشیہ میں مذکور شخصیات کا تذکرہ کیا گیا ہے''[۱۲]۔ ان بیانات کے حوالے سے یہ وضاحت مناسب معلوم ہوتی ہے کہ طبعِ ثانی کی فہرستِ مضامین پر ایک سرسری نظر ڈالنے پر راقم کو یہ گمان ہوا تھا کہ اس کے آخر میں ''تکملہ'' کا حصہ ہی جدید ایڈیشن کا اضافہ ہے جس کے تحت مزید ۴۸ علماء کا تذکرہ شامل کیا گیا ہے، لیکن یہ خلش باقی رہی کہ مصنفِ گرامی نے طبعِ ثانی کے دیباچے میں ۶۰ سے زائد علماء کے تذکرے کے اضافہ کا ذکر کیا ہے، اور متعدد مضمون نگار حضرات نے بھی اس بیان کا اعادہ کیا ہے، اسے کیسے غلط کہا جا سکتا ہے۔ بہر حال جب طبعِ اول و طبعِ ثانی کی فہرست کو دوبارہ غور سے دیکھا اور دونوں میں زیرِ تذکرہ علماء کی تعداد پر نظر ڈالی تو معلوم ہوا کہ طبعِ ثانی میں ۲۷ علماء کے تذکروں کا اضافہ ہے۔ اسی کے ساتھ جب دونوں طباعتوں کی فہرست اور متن میں مندرج علماء کے ناموں کا ایک دوسرے سے موازنہ باریک بینی سے کیا تو یہ واضح ہوا کہ طبعِ اول کے بالکل آخر میں (مصادر و مآخذ کے بعد) مصنفِ گرامی نے ''تکملۃ الکتاب'' کے تحت ۱۳ علماء کے تذکرے کا اضافہ کیا تھا، ان میں سے (ایک کو حذف کرتے ہوئے) ۱۲ تذکرے جدید ایڈیشن کے متن میں حروفِ تہجی کے اعتبار سے ان کے مقام پر شامل کر دیے گئے ہیں، اور جدید ایڈیشن کی فہرست اور متن میں مزید ۱۵ علماء کے تذکرے کا اضافہ کیا گیا ہے۔ اس طرح طبعِ ثانی کے متن میں طبعِ اول کے ''تکملۃ الکتاب'' کے ۱۲ تذکرہ جات اور مزید ۱۵ علماء کے تذکرے اضافے کے طور پر ملتے ہیں، لیکن یہ اصلاً ۱۵ ہی تذکرے کا اضافہ مانا جائے گا، اس لیے کہ ۱۲ تذکرے طبعِ اول میں ''تکملۃ الکتاب'' کے تحت (خواہ آخری حصہ میں ہی سہی) پہلے سے شامل تھے۔ اب ان ۱۵ اضافہ شدہ تذکرہ جات کو ''تکملہ'' کے تحت مندرج ۴۸ علماء کے تذکرے میں ملا دیا جائے تو طبعِ ثانی میں مجموعی طور پر ۶۳ علماء کے تذکرے کا اضافہ محقّق طور پر ثابت ہو جاتا ہے۔ اس تفصیل کے بعد مولانائے محترم کے اس بیان سے متعلق کوئی اشکال باقی نہیں رہتا کہ طبعِ ثانی میں ۶۰ سے زائد علماء کے تذکرے کا اضافہ کیا گیا ہے۔

۱۲۔ ماہنامہ دارالعلوم، دیوبند (خصوصی اشاعت / مولانا حبیب الرحمن اعظمی)، ۱۰۵/۸، اگست ۲۰۲۱ء، ص ۲۴، ماہنامہ الماس۔ خصوصی پیش کش / مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی۔ حیات و خدمات، ۱/۴، ستمبر ۲۰۲۱ء، ص ۲۴۶، ۲۲۵

اسی ضمن میں یہ وضاحت بھی مناسب معلوم ہوتی ہے کہ طبعِ اول میں بہت سے مقامات پر علماء کے تذکرے میں مذکور دیگر شخصیات کے سوانحی حالات حاشیہ میں مندرج کئے گئے ہیں۔ ان کی علیحدہ فہرست ''حیاتِ شبلی'' کے طرز پر ''فہرستِ رجالِ حواشی'' کے عنوان سے شامل کی گئی تھی، طبعِ ثانی میں بھی یہ اسی طور پر مندرج ہے۔ ان حواشی میں کتاب کے متن میں مذکور شخصیت یا شخصیات سے متعلق جو معلومات فراہم کی گئی ہیں، ان کی افادیت کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ خود یہ فہرست چار صفحات میں پھیلی ہوئی ہے۔ ان حواشی میں ۸۹ شخصیات کے بارے میں مفید معلومات مہیا کی گئی ہیں، لیکن طبعِ ثانی کے آخر میں ''تکملہ'' (اضافہ شدہ حصے) کے تحت متن میں مذکور کسی شخصیت سے متعلق کوئی حاشیہ نہیں ملتا، یعنی یہ حصہ رجالِ حواشی سے خالی ہے۔

طبعِ ثانی کے متن میں اور تکملہ کے تحت اضافہ کا زیرِ تذکرہ علماء کی تاریخِ وفات کے پہلو سے جائزہ لیا گیا تو ایک اور بات یہ سامنے آئی کہ اصل متن میں جن علماء کے تذکرے کا اضافہ کیا گیا ہے ان کا زمانہ پندرہویں صدی عیسوی (عہدِ سلطنت کے آخری حصے) کے نصف اول سے ۱۹۴۵ء تک کے عرصہ میں پھیلا ہوا ہے اور ''تکملہ'' میں جن علماء کے تذکرہ کا اضافہ ملتا ہے ان کا زمانہ جولائی ۱۹۸۱ء سے دسمبر ۲۰۱۱ء تک میں محیط ہے، یعنی ''تکملہ'' کے حصہ میں طبعِ ثانی سے پہلے کے تقریباً ۳۰ برس کے علماء کے تذکروں کا اضافہ کیا گیا ہے۔

زمانی اعتبار سے ''تذکرہ علماءِ اعظم گڑھ'' کے مشتملات کے دائرے کی وسعت اور ان کی قدر و قیمت کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ اس میں جن علماء کے احوال و کوائف اور علمی کارنامے زیرِ بحث آئے ہیں وہ سات صدیوں (آٹھویں صدی ہجری تا پندرہویں صدی ہجری) کے طویل عرصے کو محیط ہیں، یعنی ان کا زمانہ تغلق دور (۱۳۲۰ء۔ ۱۴۱۲ء) سے شروع ہو کر عہدِ مغلیہ (۱۵۲۶ء۔ ۱۸۵۷ء) اور برطانوی تسلط کے زمانہ سے آگے جدید دور کے اکیسویں صدی عیسوی کی پہلی دہائی تک پھیلا ہوا ہے۔ زمانی اعتبار (یا تاریخِ وفات) کے لحاظ سے قدیم ترین تذکرہ شیخ یوسف حسن چریّا کوٹی (فرزند اکبر مخدوم زادہ ابوالجلال اسماعیل عباسی) کا ہے۔ طبع اول میں شیخ یوسف کا تذکرہ مولانا شیخ عبداللہ یوسف چریّا کوٹی کے نام سے ہے اور طبعِ ثانی میں ان کا نام ''شیخ یوسف حسن چریّا کوٹی'' مندرج ہے۔ مصنف گرامی کے بیان کے مطابق شیخ یوسف چریّا کوٹی شیخ نصیر الدین چراغِ دہلی کے تربیت یافتہ اور ماہر علم تفسیر و حدیث تھے۔ طبع اول میں ان کا سنِ وفات ۸۰۴ھ درج ہے (طبعِ ثانی میں ان کی تاریخِ وفات

مذکور نہیں ہے)[۱۳]۔ زمانی قدامت ہی کے لحاظ سے دوسرے نمبر پر شیخ یوسف چریّا کوٹی کے والدِ محترم مخدوم زادہ ابوالجلال اسماعیل عباسی (م ۸۲۲ھ،۱۴۱۹ء) ہیں۔ عہدِ سلطنت (۱۲۰۶ء-۱۵۲۶ء) کے علماء (جن کے تذکرے زیرِ مطالعہ کتاب کی زینت بنے ہیں) میں شیخ نصیر الدین قلندرپوری (م:۹۱۵ھ،۱۵۰۹ء) خصوصی ذکر کے مستحق ہیں۔ یہ عہدِ سلطنت کے آخری حصہ سے تعلق رکھتے تھے اور سلطان سکندر لودی (۱۴۸۸-۱۵۱۷ء) کے معاصرین میں سے تھے[۱۴]۔ حسنِ اتفاق کہ شیخ نصیر الدین قلندر کا مسکن ''قصبہ قلندرپور'' (جو بعد میں تحریف ہو کر ''پلندرپور'' کہا جانے لگا) ناچیز کے گاؤں (چھتے پور) سے بمشکل ڈیڑھ دو کیلو میٹر کے فاصلہ پر واقع ہے۔ گاؤں کے لوگوں سے یہ سن کر کہ قصبہ پلندرپور (قلندرپور) میں مغل بادشاہ ہمایوں کے عہد میں تعمیر کی گئی ایک مسجد ہے، آج سے تقریباً ۴۰،۴۵ برس قبل بڑے شوق سے اسے دیکھنے گیا اور مسجد میں نصب کتبہ دیکھا، جس سے اس کا عہد ہمایونی کی ایک تعمیراتی یادگار ہونا قطعی ثابت ہو گیا۔ اسی ضمن میں یہ اضافہ بر محل معلوم ہوتا ہے کہ مغل بادشاہ ہمایوں کو شیخ نصیر الدین کے صاحب زادے و خلیفہ شیخ نور الدین (م:۱۵۵۵ء) سے گہری عقیدت تھی۔ وہ ان سے ارادت و بیعت کا تعلق رکھتے تھے۔ بعد میں شیخ نور الدین اپنے نانا و مرشد (شیخ قطب الدین بینائے دل) کے علاقے (سُرہرپور، فیض آباد) میں سکونت پذیر ہو گئے تھے۔ بادشاہ نے انہیں ضلع اعظم گڑھ و فیض آباد میں کئی مواضع جاگیر کے طور پر عطا کیے تھے، بعض مواضع پر برطانوی عہد تک ان کی اولاد کا قبضہ رہا ہے جیسا کہ مصنف محترم کے بیان سے واضح ہوتا ہے[۱۵]۔

تاریخِ وفات کی ترتیب کے لحاظ سے اس کتاب میں سب سے آخری تذکرہ مولانا محمد عارف قاسمی (ساکن جہانا گنج) کا ہے جو ایک طویل عرصہ تک دار العلوم، مئو میں صدر المدرسین اور شیخ الحدیث کے منصب پر فائز رہے ہیں، ان کا سنِ وفات ۷، محرم ۱۴۳۳ھ، ۳، دسمبر ۲۰۱۱ء ہے[۱۶]۔ یہاں یہ واضح رہے کہ جدید ایڈیشن کا سنِ اشاعت ۲۰۱۲ء ہے اور اسکے پیش لفظ کے آخر میں مندرج تاریخ ''۱۲، مارچ ۲۰۱۲ء'' ہے، آخری صاحبِ تذکرہ کی تاریخِ وفات (۳، دسمبر ۲۰۱۱ء) ہے۔ اس سے یہ

۱۳۔ تذکرہ علماءِ اعظم گڑھ (طبع اول)، ص ۱۹۵-۱۹۶؛ (طبعِ ثانی)، ص ۴۲۷

۱۴۔ ماخذ سابق، ص ۴۰۳-۴۰۴

۱۵۔ ماخذ سابق، ص ۴۰۴-۴۰۵

۱۶۔ ماخذ سابق، ص ۵۶۴-۵۶۸

صاف واضح ہوتا ہے کہ مولانا محترم کتاب کے پریس میں جانے تک اس کے مواد میں اضافے کے لیے کوشاں رہے۔

کتاب کے مطالعہ کے دوران یہ واقفیت موجبِ مسرت ہوئی اس طالب علم کے چھ اساتذہ کرام (مولانا شبلی ندوی متکلمؒ، مولانا جلیل احسن ندویؒ، مولانا غالب احسن اصلاحیؒ، مولانا داؤد اکبر اصلاحیؒ، مولانا اظہار الدین اصلاحیؒ اور مولانا مشتاق احمد اصلاحیؒ) تذکرہ کی اس بزم میں جلوہ افروز ہیں۔ مزید خوشی یہ دیکھ کر ہوئی کہ اپنے گاؤں چھتے پور کے ایک عالمِ دین (مولانا محمد خاںؒ) اور پڑوس کے گاؤں بکھرا کے تین اصحابِ علم و فضل (مولانا عبدالرحمنؒ، مولانا محمد کبیرؒ اور مولانا عبدالقیومؒ) بھی اس علمی محفل کے شرکاء میں سے ہیں۔ الحمدُ لِلّٰہِ عَلیٰ ذٰلِکَ۔

جہاں تک کتاب میں شامل علماء کے تذکرہ جات کے حجم (مختصر و طویل ہونے) کا تعلق ہے، یہ علماء کے بارے میں حاصل شدہ معلومات کی کمی بیشی کے لحاظ سے ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مختصر ترین تذکرہ تین سطری ہے۔ اہم بات یہ کہ اس تذکرے کے ضمن میں مصنفِ محترم نے یہ واضح بھی کر دیا کہ ''اس کے علاوہ مولانا محمد تقی صاحب کے بارے میں کچھ معلوم نہ ہو سکا''[۱۷]۔ کتاب میں شامل طویل ترین تذکرہ ۱۲ سے زائد صفحات پر مشتمل ہے[۱۸]۔ کتاب کے مشتملات پر نظر ڈالنے سے یہ معلوم ہوا کہ چودہ عالمِ دین کا تذکرہ پانچ سے زائد صفحات پر مشتمل ہے۔ ان میں تین حضرات (مولانا شاہ وصی اللہ فتح پوریؒ، بانیِ مدرسۃ الاصلاح مولانا محمد شفیعؒ اور مولانا حمید الدین فراہیؒ) کے تذکرے صفحات کی مجموعی تعداد کے اعتبار سے اولین مقام رکھتے ہیں۔ یہ بالترتیب بارہ، گیارہ، دس و نصف صفحات پر مشتمل ہیں۔ اسی ضمن میں یہ وضاحت مناسب معلوم ہوتی ہے کہ مولفِ گرامی کی فرمائش پر دو علماء کرام (مولانا عبدالرحمن بکھراوی م: جولائی ۱۹۲۲ء اور مولانا محمد سعید ہمئی پوری م: ۱۳؍ جولائی ۱۹۶۴ء) کے صاحب زادوں (مولانا عبدالقیوم بکھراوی اور ڈاکٹر خورشید احمد شفقت اعظمی) نے اپنے اپنے والدِ محترم کا تذکرہ تحریر کیا تھا، ان کی تحریروں کو بلا کسی ترمیم و تنسیخ کے کتاب میں شامل کیا گیا ہے، جیسا کہ مولفِ محترم نے ان تذکروں کے شروع میں اپنے نوٹ میں واضح کیا ہے[۱۹]۔

۱۷۔ ماخذ سابق، ص ۳۲۶

۱۸۔ ماخذ سابق، ص ۴۰۷۔۴۱۹

۱۹۔ ماخذ سابق، ص ۱۹۶۔۵۲۸، ۲۰۱، ۵۵۵۔۵۶۱

زیرِ مطالعہ کتاب میں علماء کے تذکرے میں مصنفِ گرامی نے عام طور پر ان امور سے متعلق معلومات فراہم کرنے کا اہتمام کیا ہے : خاندانی احوال، ذاتی کوائف، تعلیمی زندگی، عملی زندگی کی مصروفیات، تدریسی مشاغل اور مقاماتِ تدریس، علمی دلچسپی کے خاص میدان، علمی خدمات، مصنفہ ، مولفہ کتب، مذہبی و سماجی سرگرمیاں اور شخصیت کے نمایاں پہلو۔ خاندانی حالات میں عام طور پر صاحبِ تذکرہ کے آباء واجداد اور اخلاف کا ذکر ملتا ہے۔ اہلِ قلم علماء کے تذکرے میں ان کی مصنفہ و مولفہ کتب کی تفصیلات میں مطبوعہ و غیر مطبوعہ دونوں قسم کی تصانیف کی فہرست مندرج کی گئی ہے، لیکن طبعِ ثانی میں بعض علماء کے تذکرے کو پڑھ کر یہ احساس ہوا کہ دوسرے ایڈیشن کی تیاری کے دوران نظرِثانی کے مرحلے میں (غالباً وقت کی کمی کی وجہ سے) اس پہلو سے تحقیق نہیں کی جا سکی کہ پہلی اشاعت میں مندرج کسی عالم کی غیر مطبوعہ تصانیف میں سے کون کون سی بعد میں طباعت کے مرحلے سے گذر چکی ہیں۔ مثال کے طور پر پہلے ایڈیشن میں مولانا حمید الدین فراہیؒ کی ۱۶ غیر مطبوعہ تصانیف کا تذکرہ ہے، ان میں سے متعدد تصانیف زیرِ مطالعہ کتاب کے جدید ایڈیشن (۲۰۱۲ء) کے وقت اشاعت کے مرحلے سے گذر چکی تھیں۔ بلاشبہ کسی بھی صاحبِ قلم کی غیر مطبوعہ تصانیف میں سے بعد میں طبع ہو جانے والی کے بارے میں تحقیق و تفتیش کرنا مشکل اور وقت طلب کام تھا، لیکن اگر معروف و مشہور اصحابِ تصانیف کی نسبت سے یہ کام انجام پا گیا ہوتا تو کتاب کی افادیت بڑھ جاتی اور قارئین کی معلومات میں مزید اضافہ ہو جاتا۔

اس کتاب میں علماء کی بابت فراہم کردہ معلومات کا یہ ایک قابلِ ذکر پہلو یہ بھی ہے کہ ان میں جو شعر و شاعری کا ذوق رکھتے تھے، ان کے اس ذوق و شوق کے ذکر کے ساتھ ان کے کلام کے نمونے بھی پیش کئے گئے ہیں۔ مزید یہ کہ شعر و شاعری میں دلچسپی رکھنے والے جن علماء کی زبان پر پسندیدہ اشعار رواں رہتے تھے، ان کے وہ اشعار بھی نقل کیے ہیں جنہیں وہ اکثر و بیشتر گنگنایا کرتے تھے یا ان کے قریبی لوگوں کی زبان پر رواں رہتے تھے۔ اس کے علاوہ کہ اگر کسی صاحبِ تذکرہ کی وفات پر کسی سخن طراز نے قطعۂ تاریخ رقم کیا تھا یا مرثیہ گوئی کا مظاہرہ کیا تھا تو ان قطعات و مراثی کو بھی نقل کیا گیا ہے۔ اس اہتمام نے نہ صرف زیرِ مطالعہ کتاب کی ادبی چاشنی کو بڑھا دیا ہے، بلکہ مولفِ گرامی کے ذوقِ شعر و شاعری کی شہادتوں کو اور قوی کر دیا ہے۔

کتاب میں شامل علماء کے تذکرے میں ان کے حالاتِ زندگی اور دینی و علمی خدمات کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہوئے مآخذ و مراجع کے ذکر یا حوالے دینے کا اہتمام کیا گیا ہے، لیکن کچھ کو چھوڑ

کر باقی تمام حوالے متن کے اندر ہی، یا اقتباس کے خاتمہ پر دیے گئے ہیں۔ البتہ کسی عالم کے تذکرے میں ضمناً کسی دوسرے معروف عالم یا شخصیت کا ذکر آگیا ہے تو حاشیہ، حواشی میں ان کے بارے میں مفید معلومات فراہم کی گئی ہیں۔ کتابوں کے حوالے میں عام طور پر صرف ان کے نام اور متعلقہ صفحہ، صفحات نمبر مذکور ہیں (لیکن کچھ مقام پر صفحہ، صفحات نمبر بھی درج ہونے سے رہ گئے ہیں)۔ اسی طرح رسائل و مجلات کے حوالوں میں رسالے کا نام اور متعلقہ شمارے کے ماہ و سن یا شمارہ نمبر و سن کے ذکر پر اکتفاء کیا گیا ہے، یعنی رسائل کے حوالے زیادہ تر مضمون کے عنوان، مضمون نگار کے نام اور صفحات نمبر کے اندراج سے خالی ہیں۔ کتابوں کے نام کے ساتھ ان کے مصنف کے نام اور تفصیلاتِ اشاعت کے اضافے اور رسائل کے حوالوں میں مضمون کے عنوان اور مضمون نگار کے نام اور صفحات نمبر کے ذکر سے بلاشبہ حوالوں کی افادیت بڑھ جاتی ہے۔ اسی ضمن میں یہ وضاحت بھی اہمیت سے خالی نہیں کہ تذکرہ کے لیے جو معلومات زبانی طور پر حاصل کی گئی ہیں، ان اشخاص کے اسماء کے ذکر کا اہتمام کیا گیا ہے جن سے مطلوبہ معلومات ملی تھیں۔

مختلف ذرائع سے حاصل شدہ معلومات سے متعلق یہ وضاحت بھی اہمیت سے خالی نہیں کہ اگر مولفِ محترم کو کسی کتاب یا مضمون میں نقل کردہ کوئی بیان غلط نظر آیا تو اس کی تردید کرتے ہوئے انہوں نے اپنی معلومات یا تحقیق کے مطابق صحیح بات واضح کر دی ہے۔ مثلاً ایک مضمون نگار نے مولانا جلیل احسن ندویؒ کے مدرسہ مصباح العلوم (بریلی) کی تدریسی خدمت چھوڑ کر مدرسۃ الاصلاح آجانے کی وجہ مصباح العلوم کی خستہ حالی کا ذکر کیا تھا۔ اس سے اختلاف ظاہر کرتے ہوئے انہوں نے اس کی اصل وجہ یہ واضح کی کہ مدرسۃ الاصلاح میں بعض وجوہ سے بیک وقت متعدد اساتذہ کے رخصت ہو جانے کے نتیجے میں بحرانی کیفیت پیدا ہوگئی تھی۔ اس صورتِ حال میں اساتذہ کی کمی پر قابو پانے کے لیے مولانا محترم کی خدمات بھی اس مدرسہ کے لیے حاصل کی گئیں[۲۰]۔ ''نزہۃ الخواطر'' میں شاہ ابوالغوث گرم دیوان بھیرویکی تاریخِ وفات ''۲۶، جمادی الثانیہ ۱۱۷۸ھ'' مندرج ہے۔ مولفِ گرامی کے بیان کے مطابق ان کی صحیح تاریخِ وفات ''۲۵، جمادی الثانیہ'' ہے اور اس کے ثبوت میں انہوں نے شاہ صاحب مرحوم کی سوانح پر ان کے مرید و خلیفہ شاہ شمس الدین حیدری کی مولفہ کتاب (مناقبِ غوثی) کا حوالہ نقل کیا ہے۔ اسی طرح کسی شخصیت کی زندگی کے کسی پہلو سے

۲۰۔ ماخذ سابق، ص ۴۷۵

متعلق کسی کی تحریری یا زبانی روایت کی دستاویزاتی شہادت نہیں مل پائی ہے تو اسے بھی واضح کردیا گیا ہے، مثلاً مولانا محمد کبیر بکھراویؒ (م: ۱۹۴۰ء) کے تذکرے میں مولفِ محترم نے اپنے استاد گرامی مولانا عبدالقیوم بکھراویؒ کی قلمی یاداشت کے مطابق صاحبِ تذکرہ کا مظاہر علوم، سہارن پور سے سن فراغت ۱۳۴۷ھ تحریر کیا ہے اور پھر یہ وضاحت فرمائی ہے کہ ''تاریخِ مظاہر'' میں ۱۳۴۷ھ کے فارغین طلبہ کی فہرست میں مولانا کا نام نہیں ہے۔ واللہ اعلم''[21]۔

جدید ایڈیشن کی تیاری کے دوران مصنفِ محترم نے طبع اول کے مشتملات پر مختلف پہلوؤں (مواد، ترتیب، اشخاص اور کتابوں کے نام کی تصحیح یا تکمیل) سے نظر ثانی کے بعد انہیں تہذیب و تصحیح کے مرحلے سے گذارا ہے۔ اس کی کچھ مثالیں پیش کرنا افادیت سے خالی نہ ہوگا۔ اس ضمن میں سب سے پہلی ترمیم یہ ہے کہ طبعِ اول میں مصنفِ گرامی کا نام اس طور پر مذکور ہے: ''مولانا حبیب الرحمن قاسمی'' اور طبعِ ثانی میں یہ نام نامی اس طرح لکھا ہوا ملتا ہے: ''حبیب الرحمن اعظمی''۔ طبع اول میں (فہرست نمبر۔ ۸۴ کے تحت) چریّا کوٹ کے ایک عالم کا نام ''مولانا شیخ عبداللہ یوسف چریّا کوٹی'' مذکور تھا تو طبعِ جدید میں ان کا ذکر ''شیخ یوسف حسن چریّا کوٹی'' کے نام سے ہوا۔ اسی طرح طبع اول (فہرست۔ نمبر ۱۱۴، ص ۲۴۲) کے ''حضرت شیخ مبارک محمدی ماہلی''، طبع ثانی (فہرست۔ نمبر ۱۳۲، ص ۳۰۹) میں ''حضرت شیخ مبارک محمدی خیر الدین پوری ماہلی'' کے نام سے مذکور ہوئے۔ مزید یہ کہ طبع اول کے ''تکملۃ الکتاب'' کے حصے میں جن علماء کی نسبت ''اعظم گڈھی'' لکھی ہوئی تھی، اسے طبع ثانی میں ''اعظمی'' میں تبدیل کردیا گیا ہے (گرچہ طبعِ ثانی کے متن میں بعض مقامات پر (ص ۱۷۰، ۳۲۶) سرخی میں ''اعظم گڈھی'' کی نسبت باقی رہ گئی ہے جب کہ فہرست میں ''اعظمی'' ہی مندرج ہے)۔ اس نوع کی تصحیحات کی اور بھی متعدد مثالیں کتاب میں ملتی ہیں۔ مقصود یہ کہ اگر بعد میں مطالعے کے دوران مصنفِ گرامی کو کسی کے نام میں کوئی کمی یا غلطی نظر آئی تو طبعِ ثانی میں اس کی بھی تصحیح کردی گئی ہے۔ کتاب کے مواد میں تہذیب و تصحیح سے متعلق ایک قابلِ ذکر بات یہ بھی ہے کہ کتاب کے مطالعے کے بعد کسی صاحبِ علم نے اسے مزید بہتر و مفید بنانے کے لئے کوئی مشورہ دیا یا کچھ نئی معلومات فراہم کیں تو طبعِ جدید کے لیے نظر ثانی کے دوران مصنفِ محترم نے انہیں ملحوظ خاطر رکھا اور اسی کے مطابق قدیم متن میں ترمیم و اصلاح کی ہے، جیسا کہ طبعِ اول پر

۲۱۔ ماخذ سابق، ص ۳۸۲

ڈاکٹر خلیل الرحمن اعظمی مرحوم کے تاثرات کے حوالے سے مولانا محترم کا بیان اوپر گزر چکا ہے۔

طبع اول میں محولہ کسی کتاب کے غلط یا نامکمل نام کی تصحیح یا تکمیل کے اہتمام کی ایک مثال یہ ہے کہ مولانا عبدالمجید کوٹھیاوی (م: ۱۹۵۵ء) کے تذکرہ میں مصنفِ گرامی نے ان کی تصنیفی خدمات میں مولانا مفتی محمد شفیعؒ دیوبندی کی فرمائش پر قرآن سے متعلق ان کی ایک کتاب کا نام (مقدّمۃ القرآن) ذکر کیا تھا[۲۲]۔ نظر ثانی کے دوران مولانا عبدالمجید کوٹھیاوی کی مصنفہ "حمائل المرجان والزھر فی فضائل القرآن والسور" نامی کتاب کے قلمی نسخہ کی کتب خانہ دارالمصنفین میں دستیابی کی اطلاع ملی تو وہاں جاکر اسے ملاحظہ فرمایا اور طبع ثانی کے ایڈیشن میں محولہ بالا کتاب (مقدّمۃ القرآن) کا نام صحیح طور پر تحریر کیا، اس کے قلمی نسخے کی خصوصیات واضح کیں اور دارالمصنفین میں حاضری اور اس نسخہ کے ملاحظہ کرنے کی تاریخ (۱۵؍ذی الحجہ ۱۴۳۲ھ مطابق ۱۲؍نومبر ۲۰۱۱ء) بھی مندرج کی ہے[۲۳]۔

مولانا محترم کی تحریر میں زبان کی سلاست کے ساتھ ادبی لطافت کی جھلکیاں بھی جابجا ملتی ہیں۔ وہ شعر و شاعری کا اچھا ذوق رکھتے تھے، جیسا کہ پہلے کچھ ذکر آچکا ہے۔ مولانا کے قریبی رفقاء کے علاوہ خود ان کے اپنے بیان سے اس کی قوی شہادت ملتی ہے۔ دارالعلوم دیوبند کے ایک استاد نے مولانا مرحوم کے اس ذوق کے بارے میں اپنا مشاہدہ ان الفاظ میں بیان کیا ہے: "شعر و ادب کا بھی صاف ستھرا ذوق رکھتے تھے، قدیم و جدید شعراء کے سیکڑوں اشعار نوکِ زبان تھے اور موقع و محل کی مناسبت سے کوئی ایسا شعر پڑھ دیتے تھے جس سے محفل میں جان پڑ جاتی تھی۔ معتبر شعراء کے دواوین آپ کے زیرِ مطالعہ رہتے۔ یاد پڑتا ہے کہ لاک ڈاؤن سے ایک دن پہلے آپ نے فرمایا تھا کہ آجکل احمد فراز اور خلیل الرحمن اعظمی کو پڑھ رہا ہوں"[۲۴]۔ اہم بات یہ کہ مولانا محترم نے صوفی صفت ممتاز شاعر ڈاکٹر عاجزؒ (م: ۱۵؍فروری ۲۰۱۵ء) کے اعزاز میں طلبہ کے زیرِ اہتمام دارالعلوم میں منعقدہ جلسہ میں خطاب کرتے ہوئے خود اپنے بارے میں یہ فرمایا تھا: "مجھے شعر و شاعری کا ذوق ہے، اشعار کا ایک ذخیرہ میرے حافظے میں محفوظ ہے۔ میں جب علمی کتابوں کا مطالعہ کرتے کرتے تھک جاتا

۲۲۔ تذکرہ علماءِ اعظم گڑھ (طبع اول)، ص ۱۱۲

۲۳۔ ماخذ سابق، ص ۲۶۴

۲۴۔ اشرف عباس قاسمی، دشتِ علم کے سیاح حضرت مولانا حبیب الرحمن اعظمی۔ حیات و خدمات، ماہنامہ دارالعلوم، دیوبند، محولہ بالا، اگست ۲۰۲۱ء، ص ۲۱

ہوں تو پھر ذائقہ بدلنے کے لیے کسی شاعر کا دیوان اٹھالیتا ہوں جس سے مطالعہ کا مطالعہ بھی ہوتا ہے اور تفریح کی تفریح''[۲۵]۔

اسی ذوق کا فیض تھا کہ مصنفِ گرامی کی نگارشات بر محل فارسی و اردو اشعار سے مزیّن ہوتی تھیں۔ زیرِ مطالعہ کتاب میں جابجا اس کے مظاہر نمایاں نظر آتے ہیں۔ کچھ مثالوں سے انہیں مزید واضح کرنا مفید معلوم ہوتا ہے۔ سابق ناظم مدرسۃ الاصلاح مولانا بدر الدین اصلاحیؒ مجلس میں پُر لطف گفتگو، زورِ خطابت اور فی البدیہہ فصیح و بلیغ تقریروں کے لیے مشہور تھے۔ زیرِ مطالعہ کتاب میں ان کے تذکرے میں اِن خوبیوں کو اجاگر کرنے کے بعد مصنف محترم نے مرزا غالب کے شعر کا جو مصرعہ (''وہ کہیں اور سنا کرے کوئی'') نقل کیا ہے وہ نہایت بر محل اور حقیقتِ حال کا عکاس ہے[۲۶]۔ ناچیز راقم کو کبھی کبھار ناظمِ محترم کی مجلس میں شریک ہونے کا شرف حاصل رہا ہے اور بعض اوقات ان کی تقریروں سے مستفید ہونے کا موقع بھی نصیب ہوا۔ جب ان کے تذکرے میں یہ مصرعہ نظر سے گزرا تو مدرسۃ الاصلاح سرائے میر، مولانا محترم کے گاؤں نیاوج اور موضع آندھی پور (جہاں سیرت کے ایک جلسہ میں شرکت کے لیے تشریف لے جاتے ہوئے اس کمترین طالب علم کو بھی ساتھ لے گئے تھے) کے کئی مناظر آنکھوں کے سامنے آگئے۔

زیرِ تذکرہ علماء کے وفات پانے کی نوعیت یا ان کے علمی امتیازات یا وفات سے قبل کی ان کی مصروفیت یا مقامِ وفات کی مناسبت سے مولفِ گرامی نے جو الفاظ استعمال کیے ہیں یا اردو فارسی اشعار نقل کیے ہیں وہ ادبی چاشنی سے لبریز اور دل دماغ میں نقش ہو جانے والے ہیں۔ صاحبِ کتاب کے ابتدائی استادوں میں موضع چھاؤں کے مولانا علی حسنؒ (م: ۱۹۵۲ء) بھی تھے جو اپنے گاؤں کی مسجد میں قایم مکتب میں پڑھاتے تھے۔ وہ مولانا کے قریبی عزیزوں میں سے تھے اور علم و فضل کے ساتھ زہد و تقویٰ سے متصف تھے اور اسی وجہ سے نامور بزرگ مولانا عبد الغنی پھول پوریؒ نے انہیں۔ ''مولوی فرشتہ'' کا لقب دیا تھا جو ان کے لیے رائج ہو گیا۔ والدِ محترم کی ہدایت پر وہ ان کے

۲۵۔ محمد اجمل قاسمی، محقق اور دیدہ ور عالم استاذ محترم مولانا حبیب الرحمن اعظمیؒ، ماہنامہ دار العلوم،، محولہ بالا، ص ۴۴

۲۶۔ تذکرہ علماءِ اعظم گڑھ، ص ۴۶۶۔ محولہ شعر کا پہلا مصرعہ یہ ہے: ''بات پر واں زبان کٹتی ہے'' (دیوانِ غالب (مطبوعہ ۱۸۶۳ء/ عکسی)، ابن سینا اکادمی، علی گڑھ، ۲۰۱۶ء، ص ۱۳۰

گاؤں ان سے پڑھنے گئے۔ یہ سلسلہ شروع ہوئے ابھی پانچ چھ ماہ ہوا تھا کہ استاد گرامی شدید بیمار ہو کر صاحبِ فراش ہوگئے اور مسجد آنے سے معذور ہوگئے۔ وہ اِس مکتب میں تنہا مدرس تھے۔ اس حالت میں یہاں تعلیمی سلسلہ موقوف ہوگیا اور کچھ عرصہ بعد وہ دارِ فانی سے رخصت ہوگئے۔ ان کی وفات کا ذکر مع مصرعۂ فارسی مولف گرامی کے الفاظ میں ملاحظہ فرمائیں: ''اور تقریباً ایک ماہ صاحبِ فراش رہ کر یہ فرشتہ صفت انسان دنیائے دنی کو چھوڑ کر فرشتوں کے دیس سدھار گیا، اس لئے ناچار چھاؤں میں میری تعلیم کا سلسلہ منقطع ہوگیا ؎ ''آں قدح شکست وآں ساقی نماند''[۲۷]۔ موضع کوٹھیا کے مولانا عبدالمجیدؒ درس وتدریس کے ساتھ تصنیف وتالیف سے بھی شغف رکھتے تھے اور مطالعہ کتب کے بے حد شائق تھے۔ مولانا تھانویؒ سے ارادت و بیعت کا تعلق رکھتے تھے اور مولانا پھول پوریؒ سے انہیں گہری عقیدت تھی۔ ایک موذی مرض میں گرفتار ہو کر صاحب فراش ہوگئے اور محض ۳۸ سال کی عمر میں داعیِ اجل کو لبیک کہا۔ ان کے تذکرے کے آخر میں مولانا محترم رقمطراز ہیں: ''اڑتیس (۳۸) سال کی قلیل مدت میں مولانا (عبدالمجید) نے علمی میدان میں جو گراں قدر خدمات انجام دیں ان کے پیشِ نظر کہا جاسکتا ہے کہ اگر انہیں طویل عمر ملتی تو ہندوستان کے مشاہیر علماء میں آپ کا شمار ہوتا:

پھول تو کچھ دن بہارِ جاں فزا دکھلا گئے
حسرت ان غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے''[۲۸]۔

میرے گاؤں کے ڈاکٹر عمران احمد کے نانا مولانا عبدالسلام فراہیؒ (م: ۱۳/اپریل ۱۹۸۱ء) مولانا حمیدالدین فراہیؒ سے فیض یافتہ تھے۔ شبلی نیشنل کالج میں تدریسی خدمت سے سبک دوشی کے بعد گھر پر رہتے ہوئے ان کا زیادہ وقت عبادت، تلاوت وذکر میں گزرتا تھا۔ ان کی وفات کے دن کے واقعات کے ذکر میں مصنفِ محترم تحریر فرماتے ہیں: ''اس کے بعد وضو کے لیے کمرے سے باہر آئے، وضو کیا اور نمازِ ظہر ادا کی۔ چوں کہ ظہر کے بعد کچھ دیر آرام کا معمول تھا، اس لیے لیٹ گئے اور لیٹے لیٹے تسبیح پڑھنی شروع کی۔ ابھی تسبیح کے الفاظ چند بار ہی زبان سے ادا ہو پائے تھے کہ دفعتاً داعیِ اجل نے انہیں دستک دی اور اس بندۂ صاحب تسلیم ورضا نے جان جانِ آفریں کے حوالے کر دی۔ اسی دن بعد نمازِ عشا اس خزانۂ خوبی کو اس کے وطن کے قبرستان میں ہمیشہ کے لیے دفن کر دیا گیا:

۲۷۔ تذکرہ علماء اعظم گڑھ، ص ۲۷۷۔ ۲۷۸

دل کو سکون ، روح کو آرام مل گیا
موت آگئی کہ دوست کا پیغام آگیا"[۲۹]۔

اسی طرح بعض دیگر علماء (جو آخر عمر میں طرح طرح کے مصائب اور جسمانی عوارض میں مبتلا رہے) کی وفات کے ذکر میں جگر مرادآبادی کے معروف شعر کا یہ مصرعہ "عمر بھر کی بے قراری کو قرار آہی گیا"، نقل کیا گیا ہے[۳۰]۔ ان اشعار کے انتہائی برمحل اور بامعنٰی ہونے سے کون انکار کرسکتا ہے۔

ممتاز عالمِ دین وعلم تفسیر کے ماہر، متعدد مدارس میں تدریسی خدمت انجام دینے والے اور قرآن و حدیث کے خادم مولانا جلیل احسن ندویؒ کی زندگی کے آخری دن (۵؍رمضان المبارک ۸؍جولائی ۱۹۸۱ء) کے عبرت ناک واقعہ کو ایک شعر کے حوالے کے ساتھ مولفِ محترم ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے: "(فجر کی نماز کے کچھ دیر بعد) اپنے خادم کو بازار ٹارچ لانے کے لیے بھیجا اور خود مطالعہ میں مشغول ہوگئے، "تدبرِ قرآن" پڑھ رہے تھے اور جب مطالعہ کرتے کرتے تھک گئے تو اپنے خاص انداز میں کسی نکتہ کو سوچنے کے لیے لیٹ گئے اور لیٹتے ہی سانس تیز تیز آنے لگا، ایسا لگ رہا تھا کہ وہ سوگئے ہیں۔ اسی دوران خادم ٹارچ لے کر آگیا، اس نے مولانا کو آواز دی، مگر اب جواب کی سکت کہاں تھی، وہ تو سفرِ آخرت شروع کرچکے تھے:

دو ہی ہچکی میں ہوا بیمارِ غم کا فیصلہ
ایک ہچکی موت کی اور اِک تمھاری یاد کی"[۳۱]۔

طبعِ ثانی کے اضافہ شدہ حصہ (تکملہ) میں مولانا ضمیر احمد حاجی پوری (متوفی ۱۵؍اپریل ۱۹۹۰ء) کا ذکر خیر بھی شامل ہے۔ انھوں نے کتاب کی پہلی اشاعت کے کچھ دنوں بعد بنارس کے مدن پورہ محلّہ میں منعقدہ ایک تقریب میں اس کی رونمائی کی تھی۔ مولانا نے ان کے تذکرے کے آخر میں ان کی وفات کا ذکر کرتے ہوئے یہ رقم فرمایا: "اُس وقت یہ وہم وگمان میں بھی نہیں تھا کہ ایک دن خود ان (مولانا ضمیر احمد حاجی پوری) کا ترجمہ وتذکرہ کتاب کی زینت بنے گا۔ كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِيْ شَأْنٍ"[۳۲]۔

۲۹۔ ماخذ سابق، ص ۵۲۴

۳۰۔ ماخذ سابق، ص ۴۹۰، ۵۸۹

۳۱۔ ماخذ سابق، ص ۴۷۷

۳۲۔ ماخذ سابق، ص ۵۰۲

اوپر مولانا عبدالسلام فراہی کے حوالے سے ان کی وفات کے وقت کی موثر منظوم ترجمانی گذر چکی ہے۔ تقریباً اس طرح کی صورتِ حال کی دل نشیں نثری عکاسی ممتاز عالم مولانا ابوالیث اصلاحی ندویؒ (م:۵؍دسمبر ۱۹۹۰ء) کے تذکرے میں ملتی ہے۔ مولانا مرحوم کے شب وروز، جیسا کہ بخوبی معروف ہے، امیر جماعت اسلامی ہند، معاشرتی اصلاح کے سرگرم کارکن اور دین و علمِ قرآن کے خادم کی حیثیت سے کافی مصروف گزرے ہیں۔ آخر عمر میں اپنے گاؤں (چاند پٹی) میں گھر پر رہتے ہوئے ان کا بیشتر وقت نماز، تلاوت اور ذکرِالٰہی میں صرف ہوتا تھا۔ ان کی اس مصروف زندگی کی نہایت مختصر، مگر انتہائی دل نشیں ترجمانی آخری لمحات کے حوالے سے مولفِ گرامی کے ان الفاظ میں ملاحظہ کی جاسکتی ہے: ''وہیں (ڈاکٹر فرقان احمد صاحب کے نرسنگ ہوم میں) ۵؍دسمبر ۱۹۹۰ء ۱۷؍جمادی الاولیٰ ۱۴۱۱ھ کو دس بجے دن میں روح جسدِ خاکی سے پرواز کر گئی اور زندگی بھر کا تھکا ہارا مسافر ابدی نیند سوگیا''[۳۳]۔

ہمارے گاؤں کے پڑوسی گاؤں بکھرا کے متوطن اور تقریباً تقریباً ۶۴ برس تک مدرسہ بیت العلوم میں تدریس کی خدمت انجام دینے والے صوفی صفت عالم مولانا عبدالقیوم صاحبؒ جب آخر عمر میں فالج کا شکار ہوئے اور اٹھنے بیٹھنے سے بھی معذور ہوگئے تو ذمہ دارانِ مدرسہ کے اصرار پر وہ گھر جاکر فریش ہوگئے اور وہیں ۱۷؍مئی ۱۹۹۵ء کو جاں بحق ہوگئے۔ مرحوم کی خواہش کے مطابق مدرسہ بیت العلوم (جہاں ان کی ساری عمر کے لیل و نہار اور ماہ و سال گذرے تھے) ہی کے قبرستان میں سپرد خاک کئے گئے۔ اس واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے مولانا محترم نے بجا طور پر یہ تحریر فرمایا: ''پہنچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا''[۳۴]۔

''تذکرہ علماءِ اعظم گڑھ'' کے ادبی شہ پاروں یا صاحبِ کتاب کی نگارشات میں ادبی لطافتوں کا ایک نمونہ نامور مفسرِ قرآن مولانا امین احسن اصلاحیؒ کے تذکرے میں بھی ملاحظہ کیا جاسکتا ہے۔ یہ بخوبی معروف ہے کہ مدرستہ الاصلاح کے مایۂ ناز فرزندوں میں مولانا اختر احسن اصلاحیؒ (م: ۹؍اکتوبر ۱۹۵۸ء) اور مولانا امین احسن اصلاحیؒ (م: ۱۵؍دسمبر ۱۹۹۷ء) دونوں ہی کے اساتذہ ایک رہے ہیں۔ مولانا فراہیؒ سے فیض یابی میں دونوں ہی شریک رہے ہیں اور دونوں مولانا فراہیؒ کے ارشد تلامذہ میں

۳۳۔ ماخذ سابق، ص ۴۴۳

۳۴۔ ماخذ سابق، ص ۵۳۱

سے تھے اور قرآن سے بہت ہی گہرا تعلق رکھتے تھے، لیکن اِن سب کے ساتھ ان کے طرزِ کلام، مزاجی کیفیت اور علمی خدمت کے منہج اور دائرے میں فرق پایا جاتا تھا۔دونوں کی شخصیت کے مشترک و مختلف پہلوؤں کو مصنفِ محترم نے بڑے اچھے انداز اور دل نشیں پیرایہ میں بیان فرمایا ہے،اس سے اِن کے الفاظ و جملوں کے زیر و بم کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے: مولانا اختر احسن اصلاحی اور مولانا امین احسن اصلاحی دونوں نے ابتدائی تعلیم سے لے کر انتہا تک ایک ہی اساتذہ سے تعلیم و تربیت پائی۔ مولانا فراہیؒ سے اکتسابِ فیض میں بھی دونوں برابر کے شریک و رفیق رہے۔ بایں ہمہ مزاج و طبیعت کی کارفرمائی دیکھئے کہ ایک ایسا بحرِ بے کراں ہے جس کی ظاہری سطح بالکل پُر سکون اور خاموش،جب کہ دوسرا ایک بحرِ مواج وپُر شور۔ایک اگر متانت و وقار اور فروتنی وانکساری کا نمونہ ہے تو اس کے برعکس دوسرے کی بزمِ علم ”ہل من مبارز“ کی صداؤں اور بلند بانگ دعوؤں سے رزم گاہ کا منظر پیش کرتی تھی۔ایک نے اگر ایک خاص دائرے میں رہ کر اپنے علوم وافکار کی تخم ریزی کو پسند کیا تو دوسرے نے پورے برِّ صغیر کو اپنے علم و فکر کی جولان گاہ بنایا۔

ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر است“[۳۵]۔

ممتاز عالمِ دین، نامور مصنف، سابق ناظم دارالمصنفین شبلی اکیڈمی اور ناچیز مضمون نگار کے مربی گرامی مولانا ضیاءالدین اصلاحی صاحب مرحوم موضع کھریواں اپنے ایک قریبی عزیز کے گھر جاتے ہوئے راستہ میں سڑک حادثے میں شدید زخمی ہوگئے تھے۔اعظم گڑھ شہر میں مختلف ڈاکٹروں کے زیرِ علاج رہنے کے بعد بنارس ہندو یونیورسٹی کے میڈیکل کالج اسپتال میں بہتر علاج کے لیے داخل کیے گئے۔اللہ رب العزت کی مرضی کہ وہیں ان کا وقتِ موعود آگیا۔زیرِ مطالعہ تذکرہ کے مولفِ محترم نے اجلِ مسمّٰی کی اٹل حقیقت کے ذکر میں مرحوم کے نام کی مناسبت سے جو کلمات تحریر کیے ہیں وہ ان کی ایک وقیع علمی خدمت کی بڑی موثر ترجمانی پیش کررہے ہیں۔ملاحظہ فرمائیں اور الفاظ کے حسنِ انتخاب وادبی لطافت سے محظوظ ہوں: ”بالآخر ۲؍فروری ۲۰۰۸ء؍۱۴۲۹ھ کو طلوعِ آفتاب سے کچھ پہلے علم و فضل کے اس نیّرِ تاباں کی ضیاپاش کرنیں موت کی وادی میں روپوش ہوگئیں،اور علماء و صلحاء کی وفات پر تعزیتی مضامین لکھنے والا صاحبِ قلم خود داستانِ تعزیت بن گیا“[۳۶]۔

۳۵۔ماخذ سابق، ص ۴۶۲

۳۶۔ماخذ سابق، ص ۵۰۶

مولانا مفتی محمد شعیب قاسمی صاحب مرحوم بحرین جاتے ہوئے مسقط ہوائی اڈے پر عارضۂ قلب میں مبتلا ہو کر ۲۶؍ ستمبر ۲۰۱۰ء کو اچانک دارِ فانی سے رخصت ہو گئے۔ مرحوم کے تذکرے کے آخر میں اس حادثۂ فاجعہ کے ذکر کے بعد مولفِ محترم نے کیا خوب بر محل شعر نقل کیا ہے :

بس اتنی سی حقیقت ہے فریبِ خوابِ ہستی کی
کہ آنکھیں بند ہو اور آدمی افسانہ ہو جائے[۳۷]۔

علم کی خدمت میں پوری زندگی بسر کر دینے والی بعض شخصیات کے ذکر میں مولف گرامی نے یہ وضاحت کرتے ہوئے کہ نام کے علاوہ اب ان کے احوال میں کچھ نہیں ملتا امیر مینائی کا جو شعر نقل کیا ہے وہ بھی بہت بر محل معلوم ہوتا ہے :

مٹے نامیوں کے نشاں کیسے کیسے
زمیں کھا گئی آسماں کیسے کیسے[۳۹]۔

آخر میں اس حقیقت کی جانب توجہ دلانا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ کوئی بھی انسانی کاوش نقص و خامی سے مبرّا اور ہر اعتبار سے مکمل نہیں کہی جا سکتی۔ کتب و رسائل میں کتابت، کمپوزنگ، پروف ریڈنگ کی غلطی ہوتی رہتی ہے، یہ کوئی تعجب خیز بات نہیں ہے۔ اسی طرح اہلِ قلم بھی تسامحات اور بھول چوک کا شکار ہوتے ہیں۔ ''تذکرہ علماء اعظم گڑھ'' اور اس کے مصنفِ گرامی مرحوم اس باب میں کوئی استثناء نہیں رکھتے۔ تذکرہ کی کتابیں مرجع و مآخذ کے طور پر استعمال ہوتی ہیں، ان کے حوالے دیے جاتے ہیں اور زیرِ مطالعہ کتاب کو تو بلا شبہ اپنے موضوع پر اہم ترین ماخذ کی حیثیت حاصل ہے۔ اس لئے کتاب کے مطالعے کے دوران کسی شخصیت کی زندگی یا علمی خدمت سے متعلق واقعات کے بیان میں جہاں کہیں تسامحات اس ناچیز کے سامنے آئے یا جن مقامات پر کتابت، کمپوزنگ، طباعت کی غلطیاں نظر آئیں ان کی نشان دہی ضروری معلوم ہوتی ہے تاکہ اس کتاب کو ماخذ و مرجع کے طور پر استعمال کرنے یا اس سے استفادہ کرنے والے ان سے باخبر رہیں۔

زیرِ مطالعہ کتاب کی ایک انفرادیت یہ بھی ہے کہ کتاب کے شروع میں مرتب ''فہرست'' میں

۳۷۔ ماخذ سابق، ص ۵۶۴

۳۹۔ ماخذ سابق، ص ۲۴۳۔ امیر مینائی کے اس شعر کا پہلا مصرعہ صحیح طور پر اس طرح منقول ہے : ''ہوئے نامور بے نشاں کیسے کیسے''

بیشتر علماء کے نام کے ساتھ ان کا سنِ وفات ہجری میں تحریر کیا گیا ہے، لیکن کتابت، کمپوزنگ، پروف ریڈنگ کی غلطی کی وجہ سے اس فہرست میں متعدد علماء کے نام کے سامنے مندرج سنِ وفات اور متن میں ان کے تذکرے کے آخر میں مذکور سنِ وفات میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ ذیل میں اس کی نشان دہی کی جارہی ہے :

نام	فہرست میں درج سنِ وفات	متن میں مذکور سنِ وفات	صفحہ
۱۔ شیخ ابوالخیر بھیروی	۱۰۵۶ھ	۱۰۵۹ھ	۷۹
۲۔ احسان علی بھیروی	۱۳۰۰ھ	۱۳۹۹ھ	۸۴
۳۔ اختر احسن اصلاحی	۱۳۷۸ھ	۱۲۷۸ھ	۹۵
۴۔ سلامت اللہ جیراج پوری	۱۳۲۳ھ	۱۳۲۲ھ	۱۴۶
۵۔ شبلی نعمانی	۱۳۲۲ھ	۱۳۳۲ھ	۱۵۲
۶۔ عاشق نور عباسی چریاکوٹی	۱۰۳۴ھ	۸۳۴ھ	۸۳۴ھ
۷۔ عبدالرحیم مبارک پوری	۱۳۲۰ھ	۱۳۳۰ھ	۲۰۴
۸۔ عبدالصمد چریّاکوٹی	۱۳۷۱ھ	۱۱۷۱ھ	۲۱۱
۹۔ عبدالغفّار کھنڈوی	۱۳۶۴ھ	۱۳۶۳ھ	۲۲۷۔۲۲۸
۱۰۔ عنایت اللہ مئوی	۱۲۸۰ھ	۱۳۸۰ھ	۲۸۶
۱۱۔ محمد اصغر مبارک پوری	۱۳۶۴ھ	۱۳۴۶ھ	۳۲۱
۱۲۔ محمد سعید منگراوی	۱۳۹۶ھ	۱۲۹۶ھ	۳۳۸
۱۳۔ محمود احمد مئوی	۱۳۲۷ھ	۱۳۳۷ھ	۳۹۵
۱۴۔ منظور احمد کوپاگنجی	۱۳۷۲ھ	۱۳۷۳ھ	۳۹۷

کتاب میں مذکورہ بالا سنین کی غلطیوں کی نسبت سے یہ واضح رہے کہ ان میں بعض ایسی ہیں جنہیں قارئین بآسانی سمجھ سکتے ہیں۔ مثلاً علامہ شبلی کا سنِ وفات جو (۱۹۱۴ء کے بجائے) ۱۹۲۴ء مندرج ہوگیا ہے۔ کچھ غلطیاں ایسی ہیں جن کا اندازہ ان کا (ہجری یا عیسوی) مطابق معلوم کرنے سے ہو جاتا ہے اور اس طرح صحیح سن کا پتہ چل جاتا ہے۔ بعض کے بارے میں دیگر متعلقہ کتب پر نظر ڈالنے سے صحیح یا غلط کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ اس سلسلہ میں ناچیز کو معروف ذرائع سے زیرِ تذکرہ علماء کے صحیح سنِ وفات کے بارے میں جو کچھ معلوم ہوا ہے اسے ذیل میں درج کیا جارہا ہے :

متن میں مذکور شیخ ابوالخیر کا سن وفات (۱۰۵۹ھ) ہی صحیح معلوم ہوتا ہے، ''نزہۃ الخواطر'' کے مولفِ گرامی اور ڈاکٹر معتصم عباسی آزاد مرحوم نے اپنے مقالے (علمائے چریّا کوٹ) میں یہی ذکر کیا ہے [۴۰]۔ اسی ضمن میں یہ بھی واضح رہے کہ انہی کا سنِ ولادت ان کے تذکرے کے شروع میں (ص ۷۷ پر) ''۱۰۰۸ھ'' مذکور ہے، یہ بھی مشکوک نظر آتا ہے، اس لیے کہ آخر میں ان کے سنِ وفات کے ذکر کے بعد یہ واضح کیا گیا ہے کہ ''اس وقت آپ کی عمر انسٹھ سال تھی'' [۴۱]۔ اس لحاظ سے ان کا سنِ ولادت ''۱۰۰۸ھ'' صحیح نہیں معلوم ہوتا۔ طبع اول میں ان کے سنِ وفات کے بعد ان کی عمر کا ذکر نہیں ہے۔ مولانا احسان علی بھیروی کا سنِ وفات فہرست (نمبر۔۱۰) میں ''۱۳۰۰ھ'' اور متن میں ''۱۳۹۹ھ'' مندرج ہے۔ اس کے حوالے میں ''نزہۃ الخواطر'' کا ذکر ہے جب کہ اس ماخذ میں ان کا سنِ وفات ۱۳۰۰ھ ہی مذکور ہے [۴۲]۔ دوسرے ان کے حالات میں ان کے سفرِ حج کا سن ۱۲۷۳ھ ذکر کیا گیا ہے [۴۳]، اس لیے ''۱۳۰۰ھ'' ہی ان کی صحیح تاریخِ وفات ہے۔ مولانا قاضی عاشق نور محی الدین عباسی چریا کوٹی کی تاریخِ وفات فہرست میں ۱۰۳۴ھ اور اندر متن میں (ص ۱۷۵) ''۸۳۴ھ'' مذکور ہے اور اس کے بعد یہ بھی واضح کیا گیا ہے کہ ''نور افزائے جنت'' مادّۂ تاریخ ہے۔ ڈاکٹر معتصم عباسی آزاد نے بھی ان کا سنِ وفات ''۸۳۴ھ'' ہی ذکر کیا ہے [۴۴]۔ اس لیے ان کا سنِ وفات (۱۰۳۴ھ کے بجائے) ۸۳۴ھ ہی صحیح معلوم ہوتا ہے۔ مولانا محمود احمد مئوی کا جو سنِ وفات متن کے اندر ''۱۳۳۷ھ'' ملتا ہے وہی صحیح ہے، جیسا کہ نزہۃ الخواطر میں مذکور ہے [۴۵]۔ فہرست (نمبر ۴۴) میں مولانا سلامت اللہ جیراج پوریؒ کا سنِ وفات ''۱۳۲۳ھ'' اور متن میں ۱۳۲۲ھ مندرج ہے، موخر الذکر ہی صحیح معلوم ہوتا ہے اور اس کی تصدیق صاحب نزہۃ الخواطر کے بیان سے ہوتی ہے [۴۶]۔ علامہ شبلی کا سن وفات فہرست میں ''۱۳۲۲ھ'' درج ہے، اس کا غلط ہونا اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس کا عیسوی مطابق

۴۰۔ سید عبدالحہ الحسنی، نزہۃ الخواطر، دائرۃ المعارف العثمانیہ، حیدرآباد، ۱۹۹۰ء، ۱۸/۵؛ معتصم عباسی آزاد، علمائے چریّا کوٹ، اسلام اور عصر جدید (نئی دہلی) ۵/۳، جولائی ۱۹۷۳ء، ص ۸۱

۴۱۔ تذکرہ علماءِ اعظم گڑھ، ص ۷۹

۴۲۔ نزہۃ الخواطر، دائرۃ المعارف العثمانیہ، حیدرآباد، ۱۹۷۹ء، ۲۱/۷

۴۳۔ تذکرہ علماءِ اعظم گڑھ، ص ۸۳

۴۴۔ اسلام اور عصرِ جدید، محولہ بالا، ص ۷۹

۴۵۔ سید عبدالحیٔ الحسنی، نزہۃ الخواطر، دائرۃ المعارف العثمانیہ، حیدرآباد، ۱۹۷۰ء، ۴۶۳/۸

۴۶۔ ماخذ سابق، دائرۃ المعارف العثمانیہ، حیدرآباد، ۱۹۸۱ء، ۱۶۰/۸

"۱۹۰۴ء" آتا ہے جو ظاہر ہے کہ صحیح نہیں ہے اور متن میں (ص ۱۵۲ پر) تحریر کردہ "۱۳۳۲ھ" ہی صحیح ہے جس کا عیسوی مطابق "۱۹۱۴ء" ہے۔ مزید یہ کہ اسی صفحہ (۱۵۲) پر علامہ شبلیؒ کا سنِ وفات "۱۹۱۴ء" کے بجائے غلطی سے "۱۹۲۴ء" چھپ گیا ہے۔ اسی طرح استادِ گرامی مولانا شبلی ندوی متکلمؒ کے تذکرے میں (ص ۱۵۶ پر) مذکور ہے کہ "تعلیم سے فارغ ہوتے ہی اربابِ ندوہ نے دار العلوم میں بحیثیت مدرّس ان کا تقرر کر لیا، ۱۹۲۴ء مطابق ۱۳۳۲ھ میں علامہ شبلی نعمانی کی طلب پر ندوہ سے اعظم گڑھ چلے آئے"۔ ظاہر ہے کہ یہاں بھی کتابت/ کمپوزنگ کی غلطی سے (۱۹۱۴ء کے بجائے) ۱۹۲۴ء ہو گیا ہے۔ یہاں یہ بھی واضح رہے کہ طباعت کی یہ دونوں غلطیاں طبعِ اول (ص ۱۰۲، ۱۰۵) میں بھی موجود ہیں۔ فہرست (نمبر ۴۷) میں مولانا عبدالرحیم مبارک پوری کا سن وفات "۱۳۲۰ھ" مندرج ہے اور متن میں (ص ۲۰۴) "۱۳۳۰ھ" ملتا ہے۔ متن میں تحریر کردہ ہی صحیح ہے، جیسا کہ دوسرے مآخذ سے اس کی تصدیق ہوتی ہے۔[۴۷]

مولانا عبدالصمد چریا کوٹی (فہرست، نمبر ۷۹) کے بارے میں "تذکرہ علماءِ ہند" سے یہ محقّق ہو گیا کہ متن میں مندرج "۱۱۷۱ھ" ہی صحیح ہے۔ ڈاکٹر معتصم عباسی مرحوم کی تحقیق کے مطابق بھی ان کا سنِ وفات "۱۱۷۱ھ" ہے[۴۸]۔ فہرست (نمبر ۱۵۲) میں مندرج مولانا محمد سعید منگراوی کا سن وفات "۱۳۹۲ھ" ہی صحیح ہے، جو متن میں عیسوی تاریخِ وفات (۳۰، جنوری ۱۹۶۷ء) کے مطابق ہے۔ اسی طرح فہرست (نمبر ۱۸۷) کے تحت مذکور حکیم منظور احمد کوپا گنجی کا ہجری سنِ وفات "۱۳۷۲ھ" متن میں (ص ۳۹۷ پر) مندرج عیسوی تاریخِ وفات "۱۹، جولائی ۱۹۵۳ء" کے لحاظ سے صحیح ہے، یعنی متن میں مرقوم سن ہجری "۱۳۷۳ھ" غلط ہے۔

واقعات کے بیان میں کچھ فرو گذاشت یا تسامح ہو جانے کی ایک مثال استاد گرامی مولانا اظہار احمد اصلاحیؒ کے تذکرے میں ملتی ہے۔ مدرسۃ الاصلاح کی تعلیم سے فراغت کے بعد ہی استاد کی حیثیت سے اسی مدرسے میں مولانا مرحوم کی تقرری عمل میں آئی۔ ۱۹۴۶ء میں بعض وجوہ سے یہاں سے دیگر کچھ اساتذہ کے ساتھ مولانا بھی تدریس کی خدمت سے سبک دوش کر دیے گئے۔ ان کے تذکرے میں اس کے بعد کے واقعات میں یہ تحریر ہے: "یہاں سے علیحدگی کے بعد اپنے استاد مولانا نجم الدین اصلاحی کی دعوت پر "مولانا آزاد تعلیمی مرکز" اسرہٹہ، کھیتا سرائے، ضلع جون پور میں

۴۷۔ قاضی اطہر مبارک پوری، تذکرہ علمائے مبارک پور، دائرۂ ملیہ، مبارک پور، ۱۹۷۴ء، ص ۱۳۷

۴۸۔ رحمان علی، تذکرہ علماء ہند، نول کشور، لکھنؤ، ۱۹۱۴ء، ص ۱۲۱؛ اسلام اور عصرِ جدید، محولہ بالا، ص ۸۴

مدرس رہے"[۴۹]۔ یہ بیان صحیح نہیں ہے اس لیے کہ مولانا آزاد تعلیمی مرکز کا سنِ قیام ۱۹۶۲ء ہے، اس سے قبل یہاں تدریسی خدمت کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ مدرسۃ الاصلاح کے ریکارڈ کے مطابق مولانا اظہار احمد اصلاحی مرحوم نے اس مدرسہ میں وقفہ وقفہ سے تین بار تدریسی خدمات انجام دیں۔ مولانا آزاد تعلیمی مرکز میں ان کی تدریسی خدمت کا سلسلہ دوسری دفعہ (مارچ ۱۹۶۸ء میں) مدرسہ سے علیحدگی کے بعد جاری ہوا (نہ کہ ۱۹۴۶ء میں پہلی علیحدگی کے بعد)۔

مزید برآں مذکورہ بالا بیان کے ضمن میں ۱۹۴۶ء میں مدرسۃ الاصلاح سے مولانا کی علیحدگی کے عیسوی سن کا ہجری مطابق "۱۳۲۶ھ" درج ہے جو صحیح نہیں ہے۔ مدرسے کے ریکارڈ کے مطابق مولانا اظہار احمد اصلاحیؒ رمضان ۱۳۶۵ھ؍ جولائی ۱۹۴۶ء میں یہاں کی تدریسی خدمت سے مستعفی ہوئے۔ مولانا جلیل احسن ندویؒ کے تذکرے میں دائرہ حمیدیہ، مدرسۃ الاصلاح کے ترجمان "الاصلاح" کے تعلق سے ایک جگہ مذکور ہے: "الاصلاح کا اجراء شوال ۱۳۵۴ھ؍ جنوری ۱۹۳۵ء کو ہوا ہے"[۵۰]۔ ہجری ماہ و سن صحیح ہے، لیکن عیسوی سن غلطی سے "۱۹۳۵ء" درج ہو گیا ہے، جب کہ صحیح "۱۹۳۶ء" ہے، جیسا کہ رسالہ کے پہلے شمارے پر ماہ و سن اس طور پر درج ہے: "شوال ۱۳۵۴ھ؍ جنوری ۱۹۳۶ء"[۵۱]۔ سہ ماہی "اسلام اور عصر جدید" (نئی دہلی) کے ۱۹۷۳ء کے دو شماروں (اپریل وجولائی) میں ڈاکٹر معتصم عباسی آزاد مرحوم کا مقالہ "علمائے چریّا کوٹ" کے عنوان سے دو قسطوں میں شائع ہوا تھا۔ اس کے متعدد حوالے زیرِ مطالعہ کتاب میں ملتے ہیں، لیکن کچھ حوالوں (ص: ۳۹، ۱۱۵، ۳۸۵، ۳۹۳) میں (۱۹۷۳ء کے بجائے) ۱۹۷۲ء درج ہو گیا ہے۔ مصادر و مآخذ کی فہرست کے آخر (ص ۶۰۴) میں "البلاغ" کراچی کے مدیر کی حیثیت سے "مولانا امین احسن اصلاحی" کا نام نامی مذکور ہے۔ یہ بخوبی معروف ہے کہ اس رسالے کے مدیر مولانا مفتی محمد تقی عثمانی رہے ہیں۔

کتب و رسائل میں کتابت؍ ٹائپنگ؍ پروف ریڈنگ کی غلطیاں ہوتی رہتی ہیں، ان کا ذکر غیر ضروری معلوم ہوتا ہے، لیکن زیرِ مطالعہ تالیف کے اپنے موضوع پر ایک اہم مرجع ہونے کی وجہ سے

۴۹۔ تذکرہ علماء اعظم گڑھ، ص ۴۵۲

۵۰۔ ماخذ سابق، ص ۴۷۳

۵۱۔ "الاصلاح" پر تفصیلی مطالعہ کے لیے ملاحظہ فرمائیں: ضیاء الدین اصلاحی، الاصلاح: ایک تعارف، دائرہ حمیدیہ مدرسۃ الاصلاح، سرائے میر، اعظم گڑھ، ۲۰۰۷ء

اس نوع کی بعض غلطیوں کی طرف توجہ دلانا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے۔ مفتی شمس الدین کا سنِ وفات (ص ۱۶۳ پر) ٹائپنگ کی غلطی سے ''۱۰۴۷ھ'' درج ہو گیا ہے، صحیح ''۱۰۷۴ھ'' ہے۔ اس کے علاوہ طبع اول میں مصنفِ گرامی کے رقم کردہ ''پیش لفظ'' کے آخر میں نامِ نامی کے نیچے تاریخ ''۵۱؍ذی قعدہ ۱۳۷۶ھ'' درج ہے۔ ذی قعدہ ۱۳۷۶ھ کا عیسوی مطابق ۱۹۵۷ء ہوتا ہے۔ جامعہ اسلامیہ، بنارس میں مولانا مرحوم کی پہلی تقرری کا سن ۱۹۶۵ء یا ۱۹۶۶ء ذکر کیا جاتا ہے اور یہ بخوبی معروف ہے کہ انہوں نے زیرِ مطالعہ کتاب اس مدرسے سے وابستگی کے دوران تالیف فرمائی تھی۔ لہٰذا پیش لفظ کے آخر میں مندرج سن ۱۳۷۶ھ کے بجائے ''۱۳۹۶ھ'' صحیح ہوگا، جس کا عیسوی مطابق ''۱۹۷۶ء'' ہوتا ہے۔ کتابت؍ کمپوزنگ کی یہ غلطی دونوں ایڈیشن میں پائی جاتی ہے[۵۲]۔

کتاب کے آخر میں مراجع و مصادر کی فہرست ۶۰؍ کتب و رسائل پر مشتمل ہے۔ اس فہرست میں کچھ کتابوں کے مصنفین کے نام (جو طبع اول میں بھی ذکر ہونے سے رہ گئے تھے) جدید ایڈیشن میں بھی مندرج نہیں ہو سکے۔ اس کے علاوہ متعدد کتب و رسائل کا، جن کے حوالے متن کے اندر ملتے ہیں، اس فہرست میں ذکر نہیں آسکا ہے۔ اِن غیر مذکور مراجع و مصادر میں کچھ اہم کی نشان دہی کرنا افادیت سے خالی نہ ہوگا۔ ان چھوٹے ہوئے مراجع و مصادر کے ذکر میں اس طرح () کے قوسین کے اندر مصنف؍ مولف کے اسمائے گرامی کا اندراج ناچیز مضمون نگار کا اضافہ ہے۔

کتابیات میں جو مراجع و مصادر ذکر ہونے سے رہ گئے ہیں ان میں کچھ اہم یہ ہیں: تذکرۃ الحفّاظ (مولفہ شمس الدین الذہبی)، تاریخ فیروز شاہی (ضیاء الدین برنی)، منتخب التواریخ (عبد القادر بدایونی)، گلزارِ ابرار (غوثی شطاری)، تاریخِ فرشتہ (محمد قاسم فرشتہ)، آثار الصنادید (سر سید احمد خاں)، مناقب العارفین (شیخ یٰسین بنارسی)، حدائق البیان فی معارف القرآن (محمد غفور فاروقی)، سمات الاخیار (عبد المجید کاتب جونپوری)، چراغِ نور (نور الدین زیدی ظفر آبادی)، یادداشتِ چریّا کوٹ (نجم الدین عباسی)، تاریخِ مکرم؍ تاریخِ چریّا کوٹ (احمد مکرم عباسی چریّا کوٹی)، وفیات الاعلام (شاہ خوب اللہ الٰہ آبادی)، تکملہ وفیات الاعلام (شاہ میرن جان الٰہ آبادی)، تاریخ دار العلوم دیوبند (سید محبوب رضوی)، پروانۂ چراغِ مزارِ ماخودیم ما (شعیب احمد اعظمی)، کاروانِ رفتگاں (مولفہ مجیب اللہ ندوی، مرتبہ: محمد الیاس الاعظمی)، مناقبِ غوثی؍ سوانح شاہ ابو الغوث گرم دیوان (شمس الدین حیدری)، تاریخِ اعظم گڑھ (شاہ افضال اللہ قادری)،

۵۲۔ تذکرہ علماء اعظم گڑھ، طبع اول، ص ۳۱؛ طبع ثانی، ص ۴۰

آئینۂ اودھ (شاہ ابوالحسن مانک پوری)، تاریخِ مشائخ چشت (خلیق احمد نظامی)۔

مختصر یہ کہ "تذکرہ علماءِ اعظم گڑھ" مختلف اعتبار سے ایک قابلِ قدر و لائقِ مطالعہ کتاب ہے۔ معروف و مشہور خطۂ اعظم گڑھ کے علماء سے متعلق قیمتی معلومات کا مخزن ہے۔ عام قارئین و شائقینِ علم کے علاوہ محققین و ریسرچ اسکالرز کے لئے بھی یہ کتاب افادیت سے بھرپور ہے۔ مزید یہ کہ تذکرہ نگاری میں دلچسپی رکھنے والوں کے لیے یہ کتاب ایک عمدہ نمونہ ہے۔ نقص، کمی و خامی اور تسامحات سے کوئی انسانی کاوش پاک نہیں ہوتی۔ خوب کو خوب تر بنانے کی گنجائش ہر کام میں ہمیشہ رہتی ہے، خواہ وہ علمی ہو یا کسی اور نوعیت کا۔ ان سب کے علاوہ اس کتاب میں متعدد مقامات پر نثری شہ پاروں اور جگہ جگہ بر محل اشعار کے ذکر نے اسے ادبی لطافتوں اور زبان و بیان کی خوبیوں کا ایک حسین مرقع بنا دیا ہے۔ "الماس" کے محولہ بالا شمارے میں اس تذکرے کی خصوصیات پر ایک فاضل مضمون نگار کا جامع تبصرہ انہی کے الفاظ میں لائقِ نقل ہے:

> چھ سو صفحات پر پھیلی ہوئی یہ کتاب جہاں خطۂ اعظم گڑھ کی زرخیزی، عباقرۂ زماں کے سوانحی کوائف، مورخین کی تحقیقات، اہلِ قلم کی تصنیفات، علماءِ راسخین کی علمی، ادبی، تاریخی، تدریسی، اصلاحی، تحقیقی فتوحات اور ان کی قرآنی، حدیثی اور فقہی سرگرمیوں کے وسیع جزیروں سے قاری کو آشنا کرتی ہے، وہیں اعظم گڑھ کی جغرافیائی، معاشرتی، تمدنی، معاشی اور سیاسی فضا اور ماحول سے بھی باخبر کرتی ہے، نیز مولانا اعظمی کے علمی تبحر، تحقیقی مزاج، تاریخی ذوق، بالغ نظری، ژرف نگاہی اور فنِ تاریخ میں ان کے پختہ شعور اور فلک رسا ادراک و فہم کا روشن ثبوت بھی فراہم کرتی ہے[۵۳]۔

واقعہ یہ کہ زیرِ مطالعہ کتاب میں چھوٹے، چھوٹے گاؤں میں سکونت پذیر متعدد ممتاز علماء اور معمولی قریات سے تعلق رکھنے والے ماہرینِ علومِ دینیہ کے تذکرے پڑھ کر بلا جھجھک یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس کے اوراق میں جا بجا ایم۔ اے۔ او کالج، علی گڑھ کے فیض یافتہ اور دیارِ شبلی کے نامور شاعر مولانا اقبال سہیل کے اس شعر کے مصداق نظر آتے ہیں:

اس خطۂ اعظم گڑھ پر مگر فیضانِ تجلی ہے یکسر
جو ذرّہ یہاں سے اٹھتا ہے وہ نیّرِ اعظم ہوتا ہے

۵۳۔ شرف الدین عظیم اعظمی قاسمی، مولانا حبیب الرحمن صاحب اعظمی: ایک دیدہ ور مورخ، ماہنامہ الماس۔ خصوصی پیش کش / مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی۔ حیات و خدمات، محولہ بالا، ص ۳۰۶

اردو زبان میں اسلامی ادب کی تحریک

ایک تاریخی جائزہ

ڈاکٹر سید محمد عمر فاروق محمد موسی

استاذ شعبہ عربی، نظامت فاصلاتی تعلیم، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدر آباد

umarfaruqmusa@gmail.com

تحریک ادب اسلامی اردو ادب کی ایک اہم ادبی تحریک ہے۔ یہ تحریک ایک مقصدی تحریک ہے۔ اس کے پیچھے اردو زبان وادب کی پوری روایت کارفرما ہے۔ ماضی قریب میں سیاسی و تہذیبی حالات کے تقاضے کے تحت پہلے قومی اور ملی ادب وجود میں آیا، جس نے معاشرتی ترقی اور تحریک آزادی کو حوالہ بنایا۔ کچھ لوگوں نے اسلامی ادب کی مخالفت بھی کی، اس کی کمزوریوں کو اچھالنے کی کوشش کی اور اس کے خوبیوں سے صرف نظر کیا۔ اسلامی ادب کا دائرہ بہت وسیع ہے لیکن خاص طور پر توحید، رسالت اور آخرت کے تصورات بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ اس تحریک کے زیر اثر تین اصناف کو بالخصوص فروغ حاصل ہوا: شاعری، افسانہ اور تنقید۔ اس صنف کے متعلق فروغ احمد نے لکھا ہے:

> اسلامی ادب وہ ادب ہے جس میں اسلامی افکار وجذبات کی عکاسی کی گئی ہو۔ قرآنی تعلیمات، تاریخ وسیر اور سفر نامے، ملفوظات اولیاء، بزرگوں کے تذکرے، حمد و نعت، قصائد و مراثی، مثنویات اور میلاد نامے، قرآنی قصص اور اخلاقی حکایات وغیرہ کو اسلامی ادب کہا جاتا ہے[1]۔

یہ تحریک دراصل مسلمانوں کی ہزار سالہ ادبیات کا تسلسل ہے۔ اردو میں اسلامی افکار کی ترویج کا سہرا ان علماء ومشائخ کے سر جاتا ہے جنھوں نے صدیوں قبل اس کا آغاز کیا تھا۔ بر صغیر کے شمالی اور دکنی خطوں کے علماء ومشائخ کے شعر وادب میں نقطۂ آغاز ہی سے اسلامی افکار واقدار پر زور نظر آتا ہے۔ اردو شعر وادب کی ابتداء ہندوستان میں صوفیائے کرام کی مرہون منت ہے۔ انھوں نے تبلیغ اسلام کی خاطر عربی اور فارسی زبانوں کے بجائے اردو کو اختیار کیا اور اسی کو ذریعۂ اظہار بنایا۔ ان صوفیہ کے ملفوظات، رسائل اشعار اور مثنویات در حقیقت اردو میں اسلامی ادب کے اولین نقوش ہیں۔ خواجہ

۱۔ فروغ احمد، پروفیسر، جدید اسلامی ادب کا تاریخی پس منظر، ماہنامہ ''سیارہ'' لاہور، ستمبر ۱۹۹۵ء، ص: ۷۲

بندہ نواز گیسو درازؒ نے ''معراج العاشقین''، لکھی جو ان کے ملفوظات پر مشتمل ہے۔ یہ اردو نثر کی پہلی کتاب شمار کی جاتی ہے۔ یہ کتاب دعوت دین کی اولین کتاب ہے جو اردو زبان میں لکھی گئی۔

شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانیؒ کی تحریک تجدید واحیائے اسلام کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ یہ شہنشاہ جلال الدین اکبر کا دور تھا۔ اس نے ''دین الٰہی'' کے نام سے ایک نئے دین کی بنیاد رکھی تھی۔ شیخ احمد سرہندی اوران کے اصحاب نے اس کے خلاف تحریک چلائی اور دین الٰہی کے اثرات کو زائل کرنے کا کام کسی حد تک انجام دیا۔ یہ وہ دور تھا جب ہندو مت کو فروغ ملا، اور اس کے اثرات مسلم معاشرت اور ثقافت پر اثر انداز ہونے لگے۔ بے شمار غیر اسلامی رسمیں اور خرافات کو مسلمانوں نے قبول کیا اور آج تک ان رسومات کا سلسلہ جاری ہے۔ اس کے بعد اورنگ زیب عالمگیرؒ اور دارا شکوہ کا تصادم دراصل اکبری اور مجددی رجحانات کا تصادم تھا۔ دارا شکوہ آزاد خیال اور فکری اعتبار سے شہنشاہ جلال الدین اکبر کے زیادہ قریب تھا، جب کہ اورنگ زیبؒ ایک راسخ العقیدہ مسلمان تھے، علماء و صلحاء کے تربیت یافتہ تھے۔ وہ خواجہ معصومؒ کے مرید تھے، جو شیخ مجدد الف ثانی کے خلیفہ مجاز تھے۔ اورنگ زیب عالمگیرؒ کے عہد میں اسلامی افکار وخیالات، تہذیب وثقافت اور اسلامی علوم وفنون کو بہت فروغ حاصل ہوا۔ مغلیہ سلطنت کے زوال کے بعد علماء اسلام نے اردو زبان پر اپنی توجہ مرکوز کی۔ اردو کو دینی علوم کی ترویج وتدریس اور نشر واشاعت کا ذریعہ بنایا۔ بے شمار تصنیفات اردو زبان میں لکھی گئیں اور حکومت وقت نے ان علمی، ادبی اور ثقافتی کاموں کی سرپرستی بھی کی۔

اردو ادب میں اسلامی شاعری

دکن میں اردو زبان کی کمان ولی دکنی نے سنبھالی، اور اردو زبان میں لکھنا شروع کیا۔ اس عہد میں شاہ عبد الغنی مجددی، مرزا مظہر جان جاناں، خواجہ محمد ناصر عندلیب اور خواجہ میر درد وغیرہ حضرات قابل ذکر ہیں۔ یہ اہل دل کے حلقوں اور خانقاہوں سے گہرا تعلق رکھتے تھے۔ ان کے شعر و کلام میں اسلامی افکار وخیالات نمایاں نظر آتے ہیں۔ اٹھارویں صدی کے تہذیبی وسیاسی زوال کے بعد اسلامی ادب نے ایک نئی کروٹ لی اور مجددی سلسلے کے بزرگ مرزا جان جاناں نے اس عہد کی قیادت کی۔ انہوں نے ایہام گوئی اور ہندی وسنسکرت کے اثرات کے خلاف رد عمل ظاہر کیا۔ انہوں نے اردو میں عربی اور فارسی الفاظ کے استعمال کو جائز قرار دیا۔ مرزا مظہر جان جاناں کی شاعری سے اس دور کا عکس جھلکتا ہے۔ اس دور میں مسلمانوں کو جو مصائب درپیش تھے، ان کی غزلیں اس احساس کی حامل ہیں۔ مرزا

مظہر جان جاناں نے شعری صنف کی احیاء و تجدید میں بے حد محنت کی اور تلامذہ کی ایسی جماعت تیار کی جنہوں نے اس تجدیدی سمت کو پروان چڑھایا۔ان کے تلامذہ میں یقین، دردمند، بیان، حسرت اور حزیں وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ مرزا مظہر جان جاناں نے اردو کو خارجی اثرات اور دیگر زبان کے اثرات سے پاک کرنے کی انتھک کوشش کی۔ خاص طور سے سنسکرت کے اثرات کو ختم کرنے کو سیاسی اور مذہبی فریضہ سمجھا۔اس حوالے سے وہ اردو میں اسلامی ادب کے اولین معمار قرار دیے جاسکتے ہیں۔

اسلامی فکر کی شمع اردو شعر وادب میں جلتی رہی۔ مرزا مظہر جان جاناں کے بعد خواجہ میر دردؔ کے کلام میں اسلامی اور متصوفانہ خیالات وافکار ملتے ہیں۔ خواجہ میر دردؔ شیخ مجدد الف ثانی کی تحریک سے بے حد متاثر تھے۔ وہ شیخ مجدد الف ثانی کے مشرب سے وابستہ تھے۔ جس کی بنیاد توحید پر تھی۔ان کا تعلق شمالی ہند کے ایک صوفیانہ خاندان سے تھا۔ دردؔ خود بھی علمی اور عملی سطح پر تصوف کی دنیا میں بلند مقام کے مالک تھے۔ انہوں نے تقریباً سنہ ۱۷۵۰ء کے زمانے میں درویشی کا مسلک اختیار کیا تھا۔ تبسم کاشمیری لکھتے ہیں:

> خواجہ میر درد کا آستانہ اٹھارویں صدی کی دلی میں تہذیبی، روحانی اور ادبی لحاظ سے مرکز کی حیثیت رکھتا تھا۔ایک ایسے دور ابتلا میں جب دلی کے شعراء گردش روزگار سے عاجز آکر شہر سے ہجرت کر رہے تھے اور محفلیں اجڑ رہی تھیں، خواجہ میر کی خانقاہ صاحبان ذوق کے لیے ایک ادبی اور روحانی پناہ گاہ بنی ہوئی تھی[۲]۔

صوفیانہ شاعری میں میرؔ کو اول درجہ حاصل ہے۔ان کی شاعری اسلامی فکر و نظر سے مالامال ہے۔اس طرح انہوں نے اردو شاعری میں صوفیانہ شاعری کو استوار کیا۔

جب سید احمد بریلوی کی تحریک جہاد اور اصلاح عروج پر تھی اور اسلام اور مسلمانوں کے تئیں بیش بہا کارنامے انجام دے رہی تھی، تو اس تحریک سے اردو شعراء کافی متاثر ہوئے۔ خاص طور پر مومن خان مومنؔ ان میں نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کی تربیت ایک دینی اور اسلامی مدرسے میں ہوئی تھی۔ انھوں نے وقت کے نامور اساتذہ اور علماء سے کسب فیض کیا تھا۔ فارسی اور اردو کے علاوہ عربی میں بھی انہیں دست رس حاصل تھی۔ اسلامی علوم سے انہیں خاصہ شغف تھا، خاص طور سے قرآن وحدیث سے انہیں حد درجہ انہماک تھا۔ وہ سید احمد شہید اور ان کی تحریک جہاد سے بے حد متاثر تھے۔

۲۔ تبسم کاشمیری، ڈاکٹر، اردو ادب کی تاریخ، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۳ء، ص: ۶۴۲

انہوں نے ''مثنویِ جہاد'' اس وقت لکھی جب سید احمد شہید نے سکھوں کے خلاف علم جہاد بلند کیا تھا۔اس مثنوی میں جہاد کی تلقین اور شہادت کی سچی آرزو کی جھلک نظر آتی ہے۔ مومن خان مومنؔ نے اپنی تحریروں سے اور اپنی شاعری سے برصغیر سے اوہام پرستی کا خاتمہ کرنے کی کوشش کی جو سید احمد بریلوی کی تحریک کا ایک اہم مقصد تھا۔اس تحریک نے مذہب، معاشرت اور ادب تینوں شعبوں کو متأثر کیا[۳]۔

۱۸۵۷ء کے بعد مسلمان برطانوی حکومت کے انتقام کا نشانہ بنے۔ مسلمانوں پر ظلم و ستم کے پہاڑ توڑے گئے، اور دلی میں مسلمانوں کے وجود پر خطرات کے بادل منڈلانے لگے۔اس ظلم و تشدد کی داستان کو اس وقت کے شعراء نے موضوع سخن بنایا، خاص طور پر مرزا غالبؔ جو اردو شعر و ادب کے بے تاج بادشاہ تھے۔ ان کا قلم اس منظر کو بیان کرنے سے نہ رہ سکا، اور دلی کی تباہی اور بربادی کے ساتھ ساتھ مسلمانانِ ہند کی عظمت رفتگاں کا ماتم انھوں نے اس طرح کیا ہے:

بیدلی ہائے تماشا کہ نہ عبرت ہے نہ ذوق
بیکسی ہائے تمنا کہ نہ دنیا ہے نہ دیں

برطانوی عہد میں جن لوگوں نے اسلامی ادب کی ترویج و ارتقاء میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ان میں الطاف حسین حالیؔ اور محمد حسین آزادؔ وغیرہ کا نام قابل ذکر ہے۔ الطاف حسین حالیؔ علی گڑھ تحریک سے وابستہ رہے جس کے روح رواں سر سید احمد خانؒ تھے۔ دراصل یہ تحریک مسلمانوں میں تعلیمی بیداری پیدا کرنے اور مسلمانوں کے تئیں انگریزوں کی غلط فہمیاں دور کرنے کے لئے قائم کی گئی تھی۔الطاف حسین حالیؔ اس تحریک کے نقیب خصوصی بن گئے، اور انھوں نے ملی اور قومی مسائل کو موضوع سخن بنایا۔اردو شاعری میں یہ ان کا عظیم الشان کارنامہ ہے۔انہوں نے اپنے اشعار میں تاریخ اسلام اور مسلمانوں کے پسماندہ حالات کی منظر کشی کی۔ مسلم ایجوکیشنل کانفرنس اور انجمن حمایت الاسلام لاہور کے جلسوں میں شاعری کو قومی و ملی مقاصد کی نشر و اشاعت کا ذریعہ بنایا۔ ''مسدس مد و جزر اسلام'' حالیؔ کی قومی نظموں کا مجموعہ ہے۔ یہ ایک عہد آفریں کارنامہ ہے جس کو آج تک قبول عام حاصل ہے۔ اس میں مسلمانوں کی مذہبی، تہذیبی اور عملی زندگی کو پیش کیا گیا ہے اور اسلام اور مسلمانوں کے عروج و زوال کو بڑے پر اثر انداز میں پیش کیا گیا ہے۔اس میں حضور ﷺ کی سیرت،

۳۔ محمد حسن عسکری، ہمارا ادبی شعور اور مسلمان، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۴ء، ص: ۱۱۵

اور شرق و غرب میں مسلمانوں کے اخلاق و کردار کا ذکر مذکور ہے، پھر ان کے زوال کی درد بھری داستان کا نقشہ پیش کی گیا ہے۔ حالیؔ کی شاعرانہ عظمت کا اندازہ اگر کسی ایک نظم سے کیا جاسکتا ہے تو وہ نظم بلاشبہ ''مسدس مد و جزر اسلام'' ہے، مسدس کے چند اشعار نمونے کے طور پر پیش کیے جاتے ہیں:

تنزل نے کی ہے بری گت ہماری ۔۔۔ بہت دور پہونچی ہے نکبت ہماری
گئی گزری دنیا سے عزت ہماری ۔۔۔ نہیں کچھ ابھرنے کی صورت ہماری
پڑے ہیں اک امید کے ہم سہارے ۔۔۔ توقع پہ جنت کی جیتے ہیں سارے
نبی کو جو چاہیں خدا کر دکھائیں ۔۔۔ اماموں کا رتبہ نبی سے بڑھائیں
مزاروں پہ دن رات نذریں چڑھائیں ۔۔۔ شہیدوں سے جاجا کے مانگیں دعائیں
نہ توحید میں کچھ خلل اس سے آئے ۔۔۔ نہ اسلام بگڑے نہ ایمان جائے[۴]

حالیؔ کے علاوہ دوسرے شعراء نے بھی ملت اسلامیہ کی عظمت رفتہ کے مرثیے لکھے ہیں۔ شوقؔ قدوائی کی ''شکوۂ ہند''، ''نظم طباطبائی کا'' ساقی نامہ''، صفی لکھنوی کی نظمیں جو ''خطاب اہل اسلام'' کے نام سے منظر عام پر آئیں، اور اسماعیل میرٹھی کی نظمیں ''آثار سلف'' وغیرہ اس سلسلے میں شمار کی جاسکتی ہیں۔

کاروان اسلامی ادب کی شخصیات میں ایک اہم نام مولانا شبلی نعمانی کا بھی ہے۔ مولانا شبلی ابتداء میں سر سید احمد خان کی تحریک سے بے حد متاثر تھے۔ انہوں نے قرطاس و قلم کو اپنا مشغلہ بنایا، تاریخ اسلام اور اسلامی شخصیات ان کا خاص موضوع تھا۔ انہوں نے بعض قومی مسائل اور واقعات پر بھی طبع آزمائی کر کے اردو ادب میں قابل قدر اضافہ کیا۔ مولانا شبلی کا تاریخی شعور اور شاعرانہ ذوق بہت بلند تھا۔ انہوں نے مسلمانوں کے روشن عہد کی عظیم الشان روایات کو انشاء پردازانہ انداز میں دنیا کے سامنے پیش کیا۔ متعصب مستشرقین اور مغربی مؤرخین کی غلط بیانیوں اور الزامات کا بہت مدلل اور مؤثر کن اسلوب میں جواب دیا۔ جو لوگ مغرب سے متاثر ہو کر اسلام کے مستقبل اور اس کی حقانیت سے مایوس ہو رہے تھے، علامہ شبلی نے ان کے دلوں میں یقین و ایمان کی روح پھونک دی۔ انہوں نے اسلام کو جدید سائنس اور علم کی دنیا میں کامیاب ترین مذہب قرار دیا۔ علامہ شبلی اس عہد کے علماء و مفکرین کے سرخیل تھے۔ ندوۃ العلماء کے قیام میں علامہ شبلی کا بہت اہم رول ہے۔ انہوں نے

۴۔ افتخار احمد صدیقی، ڈاکٹر، کلیات نظم حالی، مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۷۰ء، ج: ۲، ص: ۹۲

علی گڑھ اور دیوبند کی تحریکوں سے الگ ایک راستہ نکالنے کی کوشش کی تاکہ عصری تقاضوں کے مطابق اسلام کی خدمت ہو سکے۔ شبلی کے مقاصد کو بعد ازاں مولانا ابوالکلام آزاد، سید سلیمان ندوی اور مولانا مودودی وغیرہ نے پایۂ تکمیل تک پہنچایا۔ ان حضرات نے شبلی کی فکر اور اسلوب نگارش کی مکمل پیروی کی۔

علامہ شبلی نے ملی اور تاریخی نظمیں بھی لکھیں جن میں: ''مساوات اسلام''، ''خلافت فاروقی کا ایک واقعہ''، ''عدل جہانگیری'' وغیرہ شامل ہیں۔ ۱۹۰۸ء سے لے کر ۱۹۱۴ء کا عرصہ مسلمانان بر صغیر کے لیے آزمائش کا دور تھا۔ یورپ اور برطانیہ سے مسلمان بہت زیادہ خفا تھے۔ اس دوران جنگ طرابلس اور جنگ بلقان پر علامہ شبلی نے پر اثر نظمیں لکھ کر مسلمانوں کے جذبات کو جگایا اور ان کے لہو کو گرمایا۔ جنگ بلقان کے زمانے میں ان کی ایک نظم ''شہر آشوب اسلام'' کے نام سے شائع ہوئی۔ اس نظم کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں:

حکومت پر زوال آیا تو پھر نام ونشاں کب تک — چراغ کشتۂ محفل سے اٹھے گا دھواں کب تک
قبائے سلطنت کے گر فلک نے کر دیے پرزے — فضائے آسمانی میں اڑیں گی دھجیاں کب تک
مراکش جا چکا، فارس گیا اب دیکھنا یہ ہے — کہ جیتا ہے یہ ٹرکی کا مریضِ سخت جاں کب تک[۵]

اس نظم کے آخری اشعار یہ ہیں:

زوالِ دولت عثماں، زوالِ شرع وملت ہے — عزیز وفکر فرزندو عیال وخانماں کب تک
پرستارانِ خاکِ کعبہ دنیا سے اگر اٹھے — تو پھر یہ احترام سجدہ گاہِ قدسیاں کب تک
جو گونج اٹھے گا عالم شورِ ناقوسِ کلیسا سے — تو پھر یہ نغمۂ توحید گلبانگ اذاں کب تک
کہیں اڑ کر نہ دامانِ حرم کو بھی یہ چھو آئے — غبارِ کفر کی یہ بے محابا شوخیاں کب تک
حرم کی سمت بھی صید افگنوں کی جب نگاہیں ہیں — تو پھر سمجھو کہ مرغانِ حرم کے آشیاں کب تک
جو ہجرت کر کے بھی جائیں تو شبلیؔ اب کہاں جائیں — کہ اب امن واماں شام ونجد وقیرواں کب تک[۶]

شبلی کے بعد حفیظ جالندھری، علامہ اقبال اور ظفر علی وغیرہ نے بھی اس طرح کی نظموں کے ذریعے زبردست کارنامے انجام دیے۔

۵۔ شبلی نعمانی، کلیاتِ شبلی اردو، دار المصنفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ، ۲۰۰۷ء، ص: ۶۵
۶۔ مذکورہ حوالہ، ص: ۶۶

بیسویں صدی کے نصف اول میں اسلامی ادب کو خوب پذیرائی حاصل ہوئی۔ بہت سے شعراء اور ادباء نے اسلامی اور دینی موضوعات کو اپنے قرطاس و قلم کا موضوع بنایا۔ ان میں اکبر الہ آبادی منفرد مقام رکھتے ہیں۔ اکبر صاحب نے پہلی بار طنز و مزاح کو اصلاح قوم کے لئے استعمال کیا۔ ان کی شاعری کا سب سے بڑا موضوع قومی و ملی تہذیب و معاشرت ہے۔ اکبر کی شاعری میں سر سید احمد خان کی تحریک کا رد عمل بھرپور ظاہر ہوتا ہے۔ اکبر الہ آبادی، شیخ جمال الدین افغانی اور ان کے افکار و نظریات سے کافی متاثر نظر آتے ہیں کیوں کہ وہ اتحاد اسلامی تحریک کے حامی اور برطانوی حکومت کے مخالف تھے۔ اکبر نے مادیت، عقلیت اور جدیدیت کے استعاروں کو تمسخر کا نشانہ بنایا[۷]۔ حالیؔ اور شبلیؔ کی طرح اکبر الہ آبادی کے سامنے بھی مسلمان قوم کے عروج و زوال کا عبرت ناک نقشہ تھا۔ اکبر نے اپنی شاعری میں مسلم قوم کو یہ احساس دلانے کی کوشش کی ہے کہ وہ خودی کو پہچانیں اور عزت و حمیت کا احساس کریں۔ انہوں نے مسلمانوں کو دعوت دی کہ حالات چاہے کتنے ہی ناساز گار ہوں وہ اپنی قومی جڑوں کو مضبوطی سے تھامے رہیں۔ ان کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں:

اک برگِ مضمحل نے یہ اسپیچ میں کہا — موسم کی کچھ خبر نہیں اے ڈالیو تمہیں
اچھا جوابِ خشک یہ اک شاخ نے دیا — موسم سے باخبر ہوں تو کیا جڑ سے چھوڑ دیں
بس یہ کہتا ہوں کہ ملت کے معانی کو نہ بھول — راہ قومی کا تو خود ہی نہ ہو رہزن پیدا
مذہبی شاخ فقط ہے تیری قومی ہستی — یہ جو ٹوٹی تو نہیں کوئی نشیمن پیدا[۸]

جب سر سید نے سیاست کو ترک کرنے کا مشورہ دیا اور معاشرتی اور معاشی مسائل اور تعلیمی اصلاح کی غرض سے انگریزوں سے تعاون کی حکمت عملی کو اختیار کیا، تو اکبر الہ آبادی ان لوگوں میں شامل تھے جنہوں نے اس حکمت عملی سے اتفاق نہیں کیا۔ الغرض شبلی، حالی اور اکبر الہ آبادی نے اردو نظم و نثر کو سیاسی، سماجی اور ملی مسائل کی ترجمانی اور اس کی اصلاح کے لئے استعمال کیا، اور ان کے بعد محمد اقبال اور ظفر علی خان نے جدید اردو ادب میں ان روایات کو فروغ دیا۔

مولانا ظفر علی خان شیخ جمال الدین افغانی کی شخصیت سے بہت متاثر تھے، بالخصوص اخوت

۷۔ محمد زکریا، خواجہ، ڈاکٹر، اکبر الہ آبادی: تحقیقی و تنقیدی مطالعہ، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۸۰ء، ص: ۱۲۱

۸۔ مذکورہ حوالہ، ص: ۱۳۵

اسلامی کے تعلق سے ان کے جو افکار و خیالات تھے۔ انھوں نے پورے عالم اسلام میں ایک طرح کی روح پھونک دی تھی۔ انہیں افکار سے متاثر ہو کر مولانا ظفر علی خان نے ماہنامہ ''دکن ریویو'' کے دو ضخیم ''اسلام نمبر'' ۱۹۰۷ء میں نکالے۔ اس علمی اور ادبی کارنامے پر انہیں اکبر الہ آبادی، علامہ شبلی، نواب محسن الملک اور دوسرے مشاہیر نے ہدیہ تبریک پیش کیا۔ اسلام نمبر میں سب سے اہم اور علمی مضمون مولانا عبد الحق کا تھا، جس کا عنوان ''العالم الاسلامی'' تھا۔ اس مضمون میں انہوں نے عالم اسلام کا بہت تفصیلی اور تحقیقی جائزہ پیش کیا ہے۔ سیاسی مسائل کے ساتھ ساتھ دینی اور ثقافتی مسائل پر بھی خاطر خواہ روشنی ڈالی ہے۔ دشمنان اسلام کی سازشیں اور مسیحی مشنریوں کی مکاری اور عیاری کو اس میں واضح کیا گیا ہے اور مسلمانوں کو اس سے متنبہ کیا ہے[۹]۔ مولانا عبد الحقؒ کے علاوہ اس خصوصی نمبر میں مولانا حسرت موہانی، فتح محمد جالندھری وغیرہ کے بھی مضامین قابل مطالعہ ہیں۔

علامہ محمد اقبالؒ اسلامی ادب کے بہت اہم رکن ہیں۔ ان کا کلام تحریکی عنصر کی حیثیت رکھتا ہے۔ انہوں نے مسلمانوں کے دلوں میں قومی شعور کو بیدار کیا۔ قیام یورپ کے دوران انہوں نے مغربی تہذیب کا بہت گہرائی سے مطالعہ اور مشاہدہ کیا، نتیجۃً انہیں صرف اسلام ہی ایسا مذہب نظر آیا جو نوع انسانی کی فلاح و بہبود کی ضمانت دے سکتا ہے۔ اقبال نے سیاست، معاشرت، تعلیم اور پین اسلام ازم کے ضمن میں جو لکھا ہے اس کا منبع اسلام ہے۔ اسی طرح ان کے تصورات عشق و خرد، مرد مومن اور فقر و توکل وغیرہ کا مطالعہ بھی اسلامی فکر کے حوالے سے کیا جا سکتا ہے۔ ۱۹۰۸ء کے بعد علامہ اقبال کا کلام اسلامی قومیت اور ملی وحدت کا شاہکار ہے۔ اس زمانے میں بہت انقلاب آفریں نظمیں منظر شہود پر آئیں۔ انہوں نے مغرب اور مشرق کی کشمکش اور دنیائے اسلام کی زبوں حالی جیسے موضوعات پر اسلامی نقطۂ نظر سے روشنی ڈالی۔ ایک نظم ''طلوع اسلام'' میں انہوں نے مسلمانوں کو ایمان اور ایقان کا درس دیا، اور اسے دنیا کی بہترین قوم اور معمار جہاں قرار دیا ہے[۱۰]۔ اس نظم کے چند اشعار دیکھیے:

۹۔ غلام حسین ذوالفقار، ڈاکٹر، مولانا ظفر علی خان: حیات و خدمات و آثار، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۳ء، ص: ۸۸

۱۰۔ فروخ احمد، پروفیسر، جدید اسلامی ادب کا تاریخی پس منظر، مطبوعہ: ماہنامہ سیارہ، لاہور، ستمبر ۱۹۹۵ء، ص: ۹۲-۹۵۔

خودی میں ڈوب جا غافل! یہ سر زندگانی ہے　　نکل کر حلقۂ شام و سحر سے جاوداں ہو جا
مصافِ زندگی میں سیرتِ فولاد پیدا کر　　شبستانِ محبت میں حریر و پرنیاں ہو جا
گذر جا بن کے سیلِ تند رو کوہ و بیاباں سے　　گلستاں راہ میں آئے تو جوئے نغمہ خواں ہو جا
ترے علم و محبت کی نہیں ہے انتہا کوئی
نہیں ہے تجھ سے بڑھ کر سازِ فطرت میں نوا کوئی"[۱۱]

علامہ اقبال نے تاریخی موضوعات اور واقعات کو بھی اپنے سخن کا موضوع بنایا، اور بڑے ولولہ انگیز پیرایے میں اس کو مرتب کر کے پیش کیا۔ انہوں نے حضور اکرم ﷺ کی سیرت، خلفاء راشدین کے کارنامے، غزوات اور بلاد اسلامیہ کے حالات وغیرہ کو نہایت پر اثر اور روح پرور انداز میں نظم کی شکل میں پیش کیا ہے۔ "بانگِ درا" میں اقبال نے اسلام کے کچھ اہم تاریخی واقعات کو بہت ہی ولولہ انگیز انداز میں پیش کیا ہے۔ اس شعری مجموعے میں چند نظمیں بہت ہی روح پرور ہیں، جیسے جنگ یرموک کا واقعہ، بلادِ اسلامیہ، حضور رسالت مآب ﷺ، صدیقؓ، بلالؓ، فاطمہؓ بنت عبد اللہ اور غلام قادر روہیلہؒ وغیرہ۔ حضور ﷺ اقبال کی نظر میں دنیائے انسانی کے سب سے بڑے محسن ہیں۔ وہ جب بھی ملی، قومی اور انسانی مصائب پر غور و فکر کرتے ہیں تو انھیں حضور ﷺ کی یاد آتی ہے، اور وہ نہایت والہانہ انداز میں رسول اللہ ﷺ کے فیضان کا ذکر کرنے لگتے ہیں۔

علامہ اقبال ایک روح پرور شاعر تھے۔ انہوں نے اپنی شاعری کے ذریعے اسلامیان برصغیر اور اردو شاعری کے مردہ جسم میں زندگی کی روح پھونکنے کی کوشش کی۔ علامہ اقبال نے احیائے دین کو اپنا مقصد بنایا۔ انہوں نے اسلامی افکار کو بہت مثبت انداز میں پیش کیا اور بسا اوقات مغربی افکار سے استشہاد کیا۔ اقبال کی قرآن و حدیث پر گہری نظر تھی۔ انھوں نے علامہ رومی کی مثنویات کا بہ نظر عمیق مطالعہ کیا تھا۔ انہوں نے قرآن پاک کے دائمی و ابدی اور عالم گیر نظریات کو اپنے کلام میں بہت اہمیت کے ساتھ بیان کیا ہے۔ ان کے نزدیک اسلام کا معاشرتی نظام ہی اصل اساس ہے جو دوسروں کے لئے بھی راہنما ثابت ہو سکتا ہے۔ انہوں نے مغربی علوم و فنون اور اخلاقیات پر تنقیدی نظر ڈالی اور قوم کی غلامانہ اور محکومانہ ذہنیت کو دور کر کے اس میں خود اعتمادی پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔

علامہ اقبالؒ نے مسلمانوں کے جمود اور انحطاط کے اسباب کی نشان دہی کی اور تصوف پر یونانی اور

۱۱۔ رفیع الدین ہاشمی، اقبال کی طویل نظمیں، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، جنوری ۱۹۸۰ء، ص: ۶۵۔

عجمی اثرات سے جو نفی ذات اور ترک دنیا کا حیات کش تصور مسلمانوں پر مسلط ہو گیا تھا، اس کی جگہ اثبات خودی اور تعمیر حیات کا اسلامی تصور پیش کیا۔ ''ابلیس کی مجلس شوریٰ'' علامہ اقبال کی انتہائی قابل ذکر تخلیق اور اردو کی بہترین نظموں میں سے ایک ہے۔ یہ نظم اقبال نے وفات سے دو برس پہلے سنہ ۱۹۳۶ء میں لکھی اور ''ارمغان حجاز'' میں بہت اہتمام کے ساتھ شائع کی۔ اس نظم کے چند اشعار پیشِ خدمت ہیں:

میں نے دکھلایا فرنگی کو ملوکیت کا خواب ۔۔۔ میں نے توڑا مسجد و دیر و کلیسا کا فسوں
میں نے ناداروں کو سکھلایا سبق تقدیر کا ۔۔۔ میں نے منعم کو دیا سرمایہ داری کا جنوں!
کون کر سکتا ہے اس کی آتشِ سوزاں کو سرد ۔۔۔ جس کے ہنگاموں میں ہو ابلیس کا سوزِ دروں
جس کی شاخیں ہوں ہماری آبیاری سے بلند ۔۔۔ کون کر سکتا ہے اس نخلِ کہن کو سرنگوں؟[۱۲]

یہ نظم بہت طویل ہے، یہ در حقیقت ابلیسی پارلیمنٹ کے ایک اجلاس کی روداد ہے۔ اس میں ابلیس اور اس کے مشیروں کے درمیان مکالمہ ہے۔ اس نظم میں جمہوری اور اشتراکی نظاموں کی خرابیوں اور تباہ کاریوں کو بہت خوبصورت انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ اسی طرح اس نظم میں سیاست، تمدن، مذہب، معیشت، نظام قومیت اور مسلمانوں کو درپیش مسائل کی نشان دہی کے ساتھ ان کے لئے عمدہ لائحہ عمل بھی تجویز کیا گیا ہے۔

اُس وقت عالم اسلام کے حالات بہت خراب تھے۔ خانہ جنگی کا بازار گرم تھا۔ ملٹن کی نظم ''جنت گم گشتہ'' میں شیاطین کی مجلس کا ذکر ہے جو خدا کے خلاف بغاوت کے منصوبے بناتی ہے، اور انسانوں بالخصوص مسلمانوں کو بہکانے کی تدابیر سوچتی ہے۔ علامہ اقبال اپنی نظم ''ابلیس کی مجلس شوریٰ'' میں ان سارے شیطانی منصوبوں کا توڑ پیش کرتے ہیں۔ اقبال کی نظر میں ابلیسی فکر کا توڑ صرف دین اسلام نے پیش کیا ہے۔ ان کے یہاں دین کا روایتی اور رواجی تصور نہیں بلکہ تحریکی اور تجدیدی تصور ہے۔

مرزا رفیع سوداؔ بھی اپنے عہد کے نامور شاعر تھے۔ نواب شجاع الدولہ اور نواب آصف الدولہ لکھنؤ نے انھیں بڑی عزت و توقیر عطا کی اور انہیں ملک الشعراء کے خطاب سے نوازا۔ انہوں نے تقریباً ۳۹ قصائد لکھے ہیں، جو اردو اور فارسی زبان میں ہیں۔ بعض تذکرہ نگاروں کا خیال ہے کہ سوداؔ نے بعض قصیدوں میں فارسی شعراء پر بازی مار لی ہے۔ سوداؔ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ

۱۲۔ رفیع الدین ہاشمی، اقبال کی طویل نظمیں، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، جنوری ۱۹۸۰ء، ص: ۲۱۵

ساتھ دیگر عظیم اسلامی شخصیات پر بھی اشعار کہے ہیں، جیسے: امام ضامن، امام زین العابدین، امام باقر، امام جعفر صادق وغیرہ۔ اس کے علاوہ انھوں نے مغل بادشاہوں کی شان میں بھی قصائد لکھے ہیں اور ان کے عروج وزوال کی داستانوں کو مختلف نظموں میں بیان کیا ہے۔ سوداؔ نے اس زمانے کے سیاسی ومعاشرتی حالات کا اچھا نقشہ پیش کیا ہے اور اپنے زمانے میں تہذیبی اور معاشرتی زوال پر ماتم بھی کیا ہے۔

مرزا رفیع سوداؔ نے اردو نثر کی تہذیب وارتقاء میں بھی گراں قدر خدمات انجام دی ہیں۔ سوداؔ نے اردو نثر کو فارسی نثر کے ہم پایہ بنانے کی بھرپور کوشش کی ان کا اسلوب تقلیدی تھا اور اس میں کسی قسم کے تجدیدی اثرات نظر نہیں آتے۔ یہ اسلوب بعد کی اردو نثر میں متروک ہو گیا۔

اردو زبان میں اسلامی نثر

اردو شاعری جس طرح اسلامی فکر سے سرشار نظر آتی ہے، اسی طرح اردو نثر بھی اسلامی فکر کا بہترین نمونہ اور انمول تحفہ ہے۔ اردو نثر تاریخی طور پر فارسی روایت کے شدید غلبے کی زد میں رہی ہے۔ شمالی ہند میں اردو نثر کی پہلی کتاب ''دہ مجلس'' یا ''کربل کتھا'' ہے۔ یہ کتاب دراصل ''روضۃ الشہداء'' کا اردو ترجمہ ہے۔ یہ محمد شاہی دور کی سب سے اہم کتاب شمار کی جاتی ہے جو فضلیؔ کی ادبی کاوش کا نتیجہ ہے۔ اس میں فارسی اسلوب کا غلبہ نظر آتا ہے، اسی لئے انور سدید کے بقول: ''فضلی اردو کے بجائے فارسی اسلوب سے زیادہ متاثر تھے۔ اس کے ترجمے گنجلک اور نثر کا اسلوب مقفی ہے۔۔۔ چنانچہ اسے اردو نثر کا نمائندہ اسلوب قرار دینا ممکن نہیں''[۱۳]۔

ریاست دکن میں اردو نثر کے فروغ ورواج میں صوفیائے کرام کا بہت بڑا کردار رہا ہے۔ ان کے تبلیغی اور صوفیانہ رسائل اردو زبان کا گراں قدر ذخیرہ ہیں۔ شمالی ہند میں یہی خدمات شاہ رفیع الدینؒ، شاہ عبد القادرؒ اور شاہ مراد اللہ انصاریؒ سنبھلیؒ وغیرہ کی ہیں جنہوں نے اردو زبان میں قرآن مجید کے تراجم کیے۔ سب سے پہلے شاہ مراد اللہؒ نے ۱۷۷۱ء میں ''پارہ عم'' کی تفسیر اردو میں لکھی۔ یہ تفسیر ''تفسیر مرادیہ'' کے نام سے کئی بار زیور طبع سے آراستہ ہوئی ہے۔ اس تفسیر کی زبان آسان اور عام فہم ہے۔ جمیل جالبی نے لکھا ہے:

۱۳۔ انور سدید، ڈاکٹر، اردو ادب کی تحریکیں، انجمن ترقی اردو، کراچی، ۱۹۸۵ء، ص: ۲۴۸

تفسیر مراد یہ ہے سے پہلے کوئی ایسی مفصل اردو تفسیر نہیں لکھی گئی تھی، اس لئے اس کو قرآن مجید کی پہلی اردو تفسیر کہنا چاہیے۔۔۔اس کتاب میں اردو زبان کے جتنے الفاظ استعمال ہوئے ہیں شاید ہی اس دور کی کسی اور تصنیف میں استعمال ہوئے ہوں"[۱۴]۔

سنہ ۱۷۱۲ء کے بعد مغلیہ سلطنت کی جڑیں کمزور ہونا شروع ہوئیں۔ جاٹوں، مرہٹوں اور سکھوں کی مسلسل یورشوں اور تباہ کاریوں سے پورا ہندوستان تقریباً ایک صدی تک لرزتا رہا۔ دلی کی مرکزی حکومت مدافعت کے قابل نہ رہی۔ بے راہ روی، بے دینی اور ظلم و تشدد کے واقعات روز بہ روز بڑھتے رہے۔ اس پر خطر دور میں اللہ نے مسلمانان ہند کی رہنمائی اور ان کی نشاۃ ثانیہ کے لئے شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کو ذریعہ اور سبب بنایا۔ اور انہوں نے ہندوستان کی سیاسی، تہذیبی، ثقافتی اور اقتصادی صورت حال کا تجزیہ کیا، اور زوال سے نکلنے کے راستے متعین کیے، جس میں دعوت اسلام سب سے اہم بنیاد ہے۔ اس مقصد کو بروئے کار لانے کے لئے انہوں نے قرآن کریم کا ترجمہ کیا اور یہاں سے شاہ ولی اللہ کی ایک نئی تحریک کا آغاز ہو گیا۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کی تعلیمات سے مسلمانوں میں پہلی بار وسیع پیمانے پر ایک قسم کا تحریکی شعور ابھرا۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ اردو کے کلاسیکی، اسلامی ادب کے سرمایہ میں تحریکیت کے آثار رونماں ہوئے۔ اردو اب تک ثقہ حضرات کی علمی زبان نہیں تھی لیکن شاہ عبد القادرؒ نے قرآن پاک کا اردو ترجمہ کر کے گویا اس بند کو توڑ دیا، اور اسلامی افکار وجذبات کا ایک رکا ہوا دھارا اردو کی طرف تیزی سے چل پڑا۔ شاہ ولی اللہؒ کے بڑے فرزند شاہ رفیع الدینؒ نے اپنے والد محترم کی تحریک کی کمان سنبھالی۔ انہوں نے قرآن مجید کا اردو زبان میں ترجمہ کیا اور سورہ بقرہ کی تفسیر عام بول چال کی زبان میں لکھی، جو ''تفسیر رفیعی'' کے نام سے شائع ہو چکی ہے۔ لیکن یہ ترجمہ تحت اللفظ ہونے کی وجہ سے غیر مربوط ہے۔ اس ترجمے کو ادبی شہ پارہ تو نہیں کہا جا سکتا البتہ اس ترجمے سے قرآن مجید کے تراجم کا ایک بہترین سلسلہ چل پڑا۔ شاہ رفیع الدینؒ نے صرف سورۂ بقرہ کی تفسیر لکھی ہے۔ اس کی زبان عام بول چال کی زبان ہے اور اسلوب نہایت سادہ اور سلیس ہے۔[۱۵] چونکہ ان تراجم کا مقصد عوام الناس تک قرآنی مفاہیم کو پہنچانا تھا، لہذا ان کی زبان سادہ، عام فہم اور

۱۴۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، تاریخ ادب اردو (جلد دوم، حصہ دوم)، ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس، دہلی، ۲۰۱۲ء، ص: ۱۰۴۴۔

۱۵۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، تاریخ ادب اردو (جلد دوم، حصہ دوم)، ۲۰۱۲ء، ص: ۱۰۴۶۔

رواں ہے۔اس طرح کی سادہ اور صاف ستھری عبارت اس دور کی عام ادبی نثر میں نہیں ملتی۔اسی کی بدولت اردو میں اظہار کی غیر معمولی صلاحیت پیدا ہوگئی، اور یہی اسلوب فورٹ ولیم کالج کے مصنفین اور بعدازاں سرسید احمد کی تحریک کے مصنفین کا رہنما بنا۔

فورٹ ولیم کالج کے مصنفین میں ایک بڑا نام میر امنؔ دہلوی کا ہے۔ ان کی کتاب ''باغ وبہار''اردو نثر کی بہترین شاہکار ہے۔ صدیاں گزر جانے کے بعد بھی اس کی مقبولیت میں کمی نہیں آئی۔اس کتاب کا عربی زبان میں بھی ترجمہ کیا گیا ہے۔ یہ کتاب آج بھی ذوق وشوق سے پڑھی جاتی ہے۔اس کتاب کی زبان نہایت سادہ اور عام فہم ہے۔ بعض قدامت پسند ادباء نے اس کے اسلوب پر رد عمل بھی ظاہر کیا تھا، جس میں رجب علی بیگ کا نام اول نمبر پر آتا ہے۔اس دور کے داستانوں اور افسانوں میں تبلیغ اسلام کا جذبہ ایک مرکزی خیال کی حیثیت رکھتا ہے۔افسانوں کے بنیادی کردار ہمیشہ اسلام اور اس کی تعلیمات کے علم بردار ہوتے تھے۔ان میں اخلاق و کردار، صبر و تحمل، ایثار وقربانی اور ہمت وعزم ایسی پسندیدہ صفات کی بار بار تلقین کی جاتی ہے۔خیالی کرداروں کے روپ میں ہمیشہ حق و باطل کی معرکہ آرائی پیش کی گئی ہے۔بقول ڈاکٹر جمیل جالبی:

> ان کرداروں کا مزاج اس اسلامی عقیدے سے بنا ہے جہاں مایوسی کفر ہے۔ کسی بھی کردار میں عزم کی کمزوری اس لئے محسوس نہیں ہوتی کہ وہ اللہ کی ذات سے ذرا بھی مایوس نہیں ہوتا[۱۶]۔

اس لحاظ سے ان افسانوں اور داستانوں کو اپنے عہد کی اصلاحی تحریکات کا ایک دوسرا اور اہم پہلو قرار دیا جاتا ہے۔اس دور کے داستان نویس اور افسانہ نگار اخلاقیات کی تعلیم و تبلیغ کے لیے موقع تلاش کرتے نظر آتے ہیں۔ان کی داستانوں اور افسانوں کے خاص موضوعات اللہ کی ذات پر بھروسہ، دعا کی طاقت، اولیاء اللہ اور درویشوں سے والہانہ عقیدت اور حق و باطل کے معرکے میں حق کی جیت وغیرہ تھے۔

فورٹ ولیم کے مصنفین کے علاوہ سید احمد شہیدؒ کی تحریک نے بھی اردو زبان کی ترقی میں اہم رول ادا کیا ہے۔اس تحریک کے مبلغین نے سلیس اور سادہ زبان میں ایک زبردست لٹریچر تیا کیا جو اردو اور اسلامی ادب کا عمدہ ذخیرہ ہے۔اس کے بعد شاہ اسمٰعیل شہید نے ایک معرکۃ الآرا کتاب لکھی جو ''تقویۃ الایمان'' کے نام سے موسوم ہے۔یہ کتاب اگرچہ کہ فنی اعتبار سے بہت ممتاز نہیں ہے، لیکن اردو نثر کے میدان میں اسے نمایاں مقام حاصل ہے۔ سرسید احمد خان بھی اس کتاب سے متاثر

۱۶۔مذکورہ حوالہ، ص: ۱۱۰۰

ہوئے تھے۔

جدید اردو نثر کا آغاز سر سید اور ان کے رفقاء سے ہوتا ہے۔ وہ نثر بھی بنیادی طور پر دین اسلام کے فروغ کے لئے ہی عالم وجود میں آئی تھی۔ قرآن کریم کے متعدد تراجم منظر عام پر آئے۔ خود سر سید احمد خان نے قرآن کریم کا ترجمہ ''تفسیر القرآن'' اردو نثر میں کیا۔ سر سید کے رفقاء میں مولوی نذیر احمد نے بھی اس میدان میں گراں قدر خدمات انجام دیں۔ ڈاکٹر وحید قریشی لکھتے ہیں:

> نذیر احمد دہلوی کا ترجمہ قرآن اس لحاظ سے انقلاب آفریں ضرور ہے کہ اس میں انھوں نے جو زبان استعمال کی ہے اس میں محاورہ اور روز مرہ کے علاوہ جملوں کے در وبست کو اردو قواعد کے تابع کر دیا ہے۔ اس سے قبل قرآن پاک کے اردو تراجم میں عربی قواعد کا لحاظ رکھا جاتا تھا[۱۷]۔

اسی طرح مولوی نذیر احمد نے ناول نگاری میں طبع آزمائی کی ہے۔ ان کے سات ناول زیورِ طبع سے آراستہ ہو کر قبولِ عام وخاص ہوئے۔ ان کے ان ناولوں کا موضوع دینی اور اصلاحی تھا۔ انھوں نے اپنے ناولوں میں شراب وشباب، حسن وعشق کے بجائے مسلمانانِ دہلی کے سماجی، معاشرتی اور اخلاقی مسائل کو اپنا موضوع بنایا۔ ان ناولوں کو ادبی اور فنی اعتبار سے دیکھا جائے تو یہ اردو ادب میں گراں قدر سرمایہ ہیں۔

علامہ شبلی نعمانی، علامہ سید سلیمان ندوی اور مولانا ابوالکلام آزاد نے برطانوی سامراج کے خلاف قلمی جہاد کی صدا بلند کی۔ انھوں نے اپنے افکار و نظریات کو عوام الناس تک پہنچانے کے لئے اردو زبان کا سہارا لیا، اردو زبان میں رسائل کا اجراء کیا۔ علمی، فکری، ادبی اور اصلاحی مضامین لکھے۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے ''الہلال'' اور ''البلاغ'' کے ذریعے اپنے مقصد کو پایۂ تکمیل تک پہونچایا۔ علامہ سید سلیمان ندوی نے رسالہ ''معارف'' کی بنیاد رکھی، جس نے بڑی علمی اور ادبی خدمات انجام دی ہیں۔ سید سلیمان ندوی اور مولانا عبدالسلام ندوی نے انتہائی مؤثر انداز میں اسلام کے اخلاقی اور معاشرتی نظام کو پیش کیا۔ انھوں نے اپنے مقالات اور نگارشات میں علامہ شبلی کی فکر اور اسلوب نثر کی پیروی کی۔

مولانا ابوالکلام آزاد کی نثر بھی خالص دینی اور اسلامی ہے۔ انھوں نے اپنی تحریروں کے ذریعہ مسلمانوں میں سیاسی اور دینی شعور کو بیدار کیا، ان کے اندر تحریکی عنصر کو جگایا۔ شبلی نے مسلمانوں کو ماضی پر اعتماد کرنا سکھایا اور تاریخ سے ان کا تمدنی تعلق قائم کیا اور مولانا ابوالکلام آزاد نے اس میں

۱۷۔ وحید قریشی، ڈاکٹر، اردو نثر کے میلانات، مکتبہ عالیہ، لاہور، طبع اول: ۱۹۸۶ء، ص: ۷۸۔

تعمیری جارحیت کا رنگ پیدا کیا۔ مولانا آزاد نے اردو نثر کو مغربی فکر اور تہذیب و تمدن پر کڑی تنقید اور نکتہ چینی کے لئے وقف کردیا۔ ان کا اسلوب خطیبانہ اور ولولہ انگیز ہے۔ انہوں نے ''تذکرہ''، ''ترجمان القرآن'' اور ''غبار خاطر'' میں زبردست انشاء پردازی کا مظاہرہ کیا۔ اسی لئے انہیں عہد جدید میں اردو ادب کا معمار اور مجدد تسلیم کیا جاتا ہے۔ علامہ شبلی کے بعد مولانا ابوالکلام آزاد پہلے بڑے مصنف ہیں جنہوں نے مذہبی تصانیف کا معیار بلند کیا اور جدید علمی نظریات سے مستفید ہوئے۔ ان کا بنیادی مقصد احیائے اسلام تھا۔ انہوں نے مسلمانان ہند کے دلوں میں بیداری، جرأت اور ہمت کے جذبات کو زندہ کیا۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے دبستان سرسید کی عقلیت و مغربیت پسندی کے مقابلے میں حب ملت اور مشرقیت کا امتزاج پیش کیا۔ سرسید احمد خان نے مشرقی تہذیب و تمدن میں مغربی تہذیب و تمدن کا جو پیوند لگانے کی کوشش کی تھی مولانا آزاد اس کے سخت خلاف تھے۔

مولانا ابوالاعلیٰ مودودیؒ کا رسالہ ''ترجمان القرآن'' ادب اسلامی کے اعتبار سے نمایاں حیثیت کا حامل ہے۔ مولانا مودودیؒ نے اس رسالے کے ذریعہ مغرب کے فکری و نظریاتی یلغار کا مقابلہ کیا اور تجدید اور احیائے دین کا فریضہ انجام دیا۔ آپ کے مضامین ''الجمعیۃ'' کے علاوہ ''معارف'' اور دوسرے علمی رسائل میں بھی شائع ہوتے تھے۔ مولانا مودودی کی پہلی کتاب ''الجہاد فی الاسلام'' ۱۹۲۸ء میں شائع ہوئی۔ اس کتاب کے ذریعہ مولانا مودودیؒ کو قبول عام حاصل ہوا۔ اس کتاب کے ذریعہ انہوں نے اسلام کی دعوت کو ایک نئے انداز اور سلیقے کے ساتھ پیش کرنے کی کامیاب کوشش کی۔

مولانا مودودیؒ کی نثر ادبی اور فنی اعتبار سے ایک شاہکار ہے۔ انھوں نے مختلف اسلامی موضوعات پر کتابیں لکھیں۔ انھوں نے جدید تقاضوں اور حالات حاضرہ کے پس منظر میں اسلامی ریاست، اسلامی تمدن، اسلامی معیشت، اسلامی تعلیم اور اسلامی عالمی حکمت عملی کے تصورات کو پیش کیا۔ وہ خلافت راشدہ کا احیاء چاہتے تھے۔ ان کے نزدیک خلافت راشدہ کا قیام ہی پیچیدہ مسائل کا حل ہے۔ بہت سے اہل علم حضرات نے مولانا مودودیؒ کی کچھ اجتہادی اور سیاسی آراء سے اختلاف کیا ہے لیکن اس بات سے انکار ناممکن ہے کہ دور جدید میں اسلام کی تشریح اور تعبیر پر مبنی ان کا کام منفرد حیثیت رکھتا ہے۔

عہدِ جدید میں اسلامی ادب کی تحریک

۱۹۴۲ء سے تحریک ادب اسلامی کا باضابطہ طور پر آغاز ہوا۔ نعیم صدیقی اس کے اصل محرک تھے۔ وہ

ماہنامہ ''چراغِ راہ'' کراچی کے منصبِ ادارت پر فائز تھے، اور یہ رسالہ ان کے افکار و خیالات کا ترجمان تھا۔ قیام پاکستان کے بعد اسعد گیلانی نے ''جہانِ نو'' اور ماہر القادری نے ''فاران'' جاری کر کے تحریک ادب اسلامی کو تقویت بخشی۔ اسی فکر کے نتیجے میں اسلامی ادیبوں کی ایک جماعت جو ۲۵؍افراد پر مشتمل تھی اکٹھا ہوئی اور ادارہ ادب اسلامی کا قیام عمل میں آیا۔ اس تحریک کا مقصد اردو شعر و ادب کو الحاد و اشتراکیت سے نجات دلا کر ایک صالح معاشرے کی تشکیل و تعمیر تھا۔ پاک و ہند کے بہت سے کہنہ مشق ادباء اور شعراء اس تحریک سے متاثر ہوئے۔ بے شمار رسالے اور ماہنامے منظر شہود پر آئے۔ طیب عثمانی صاحب کی ادارت میں نکلنے والے ماہنامہ ''نئی نسلیں''، لکھنؤ نے اس تحریک کو کافی آگے بڑھایا اور منظم کیا۔ رامپور، الہ آباد اور ٹانڈہ وغیرہ کے اصحاب قلم اور اہل نظر حضرات بھی اس سے وابستہ ہوئے، خاص طور پر محمد اسحاق، شبنم سبحانی، حسان کلیمی، فضل الرحمن فریدی وغیرہ۔

۶؍جنوری ۱۹۵۷ء میں ادارہ ادب اسلامی کی جانب سے ایک آل انڈیا ادبی کانفرنس منعقد کی گئی جس میں ملک کی نامور شخصیات نے شرکت کی۔ شفیق جونپوری اور عامر عثمانی نے صدارتی خطبے پیش کیے۔ مولانا عبدالماجد دریابادی، پروفیسر ضیا احمد بدایونی، مختار احمد مظاہری، سید زین العابدین، برق علوی اور تسنیم فاروقی وغیرہ نے شرکت کی اور اپنے وقیع اور قیمتی مقالے پیش کیے۔ اب گویا تحریک ادب اسلامی کا منظم اور باضابطہ طور پر آغاز ہو چکا تھا۔ بعض بزرگ شعراء مثلاً شفیق جونپوری، ماہر القادری، روش صدیقی، عرشی بھوپالی اور نازش پرتاب گڑھی نے بھی اپنا دست تعاون بڑھایا۔ ہندوستان میں تحریک ادب اسلامی کے لئے پروفیسر انور صدیقی کی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔ ان کی غزلیں اور ان کے مقالات اسلامی ادب کا بہترین سرمایہ ہیں۔ اسی طرح شمس الرحمن فاروقی نے، جو بہت بڑے ادیب اور مفکر شمار کیے جاتے ہیں، اپنے ادبی کیریئر کا آغاز تحریک ادب اسلامی ہی سے کیا۔ ان کے مقالات اور تخلیقات ادب اسلامی کی ترقی اور آگے بڑھانے میں بہت کارگر ثابت ہوئے۔

عصر حاضر میں تحریک ادب اسلامی نے اردو ادب کو نئی سمت عطا کی۔ یہ نیا رجحان تعمیری ادب کی شکل میں سامنے آیا۔ اسلامی ادب کی تحریک کو فروغ دینے کے لئے مختلف مقامات پر ادارہ ادب اسلامی کی شاخیں قائم کی گئیں۔ حفیظ میرٹھی، کلیم عاجز، ابوالمجاہد زاہد، مصلح الدین، تابش مہدی اور مائل خیرآبادی وغیرہ نے اپنے قلم کا دھارا اسلامی ادب کی سمت موڑا۔ ان کی نظم و نثر اسلامی ادب کا بہترین نمونہ ہیں۔ اس تحریک کو بام عروج تک پہنچانے میں ہند و پاک کا برابر حصہ ہے۔ پاکستان میں اسلامی ادب پر بہت کچھ لکھا گیا۔ متنوع اصناف سخن جیسے ڈرامہ و افسانہ، نظم و غزل اور تحقیق و تنقید کے

میدان میں کامیاب تجربے ہوئے، خاص طور سے نعتیہ شاعری میں نت نئے تجربے سامنے آئے۔ شعری تخلیقات کے لئے سر زمین پاکستان کافی زرخیز نظر آتی ہے۔ وہاں اسلامی حلقوں میں شعراء کی بڑی تعداد موجود ہے۔ ان کی نگارشات نظم و نثر کی شکل میں کئی ادبی رسائل کی زینت بنتی رہتی ہیں۔

ڈھاکہ میں پروفیسر فروغ احمد اسلامی ادیبوں میں ممتاز مقام کے حامل ہیں۔ ڈھاکہ میں رہتے ہوئے انہوں ادب اسلامی کے فروغ اور احیاء کے لئے گراں قدر خدمات انجام دیں۔ ۱۹۶۸ء میں ان کی ایک کتاب ''اسلامی ادب کا جائزہ'' لاہور میں شائع ہوئی تھی جس میں اسلامی ادب کی نظریاتی اساس، اس کا تاریخی پس منظر اور اردو ادب پر اسلامی تحریکات کے اثرات پر مضامین شامل ہیں۔ اسی طرح پروفیسر اسرار احمد سہاوری نے ''ادب اور اسلامی قدریں'' کے عنوان سے مقالات تحریر کیے، جن میں انھوں نے ادب اور اسلامی قدروں کے باہمی تعلق کو اجاگر کیا اور، اسلامی ادب کی خصوصیات، اسلامی ادب کے موضوعات اور خصوصیات وغیرہ پر بہت تفصیل سے بحث کی۔ سلیم احمد مرحوم اپنے ادبی کالموں، ڈراموں شاعری اور تنقیدی معرکہ آرائی کے لئے بے حد متحرک و فعال اور معروف و مقبول شخصیت رہے ہیں۔

ادب اسلامی سے متعلق کچھ لکھا اور بولا جاتا ہے تو مولانا ابوالحسن علی ندویؒ کو بھولا نہیں جا سکتا۔ گویا تحریک ادب اسلامی کی تاریخ مولانا علی میاںؒ کے بغیر نامکمل ہے۔ مولانا عالم اسلام کی وہ عظیم شخصیت ہیں کہ جن کی علمی اور ادبی تحقیقی اور تصنیفی خدمات اور عظمت کا لوہا عرب و عجم میں مانا جاتا ہے۔ عالم عرب میں سب سے پہلے اگر کسی نے ادب اسلامی کی صدا بلند کی وہ مولانا ابوالحسن علی ہیں۔ عربی زبان میں اسلامک لٹریچر کو ادب کا درجہ نہیں دیا جاتا تھا، لیکن مولانا کی گونا گوں محنت اور مسلسل جدوجہد اور فکر کی وجہ سے عالم عرب میں باضابطہ ''رابطہ ادب اسلامی'' کا قیام عمل میں آیا۔ بے شمار عرب علماء نے اس تحریک کا خیر مقدم کیا اور اس سے منسلک ہوئے۔ مولانا ابوالحسن ندویؒ کو عربی اور اردو دونوں زبانوں میں دست رس حاصل تھا۔ آپ کے مضامین عرب و عجم کے اخبارات میں بہت اہتمام کے ساتھ شائع ہوتے تھے، اور قدر کی نگاہوں سے پڑھے جاتے تھے۔ ''رابطہ ادب اسلامی'' صرف عربی زبان تک ہی محدود نہ تھا بلکہ اردو زبان و ادب میں بھی اس کے آثار نمایاں ہیں۔ مجلہ ''ادب اسلامی'' اردو زبان میں نشر ہونے والا وہ مجلہ ہے جو ہندوستان میں تحریک ادب اسلامی کا محافظ ہے۔ اس مجلہ کے اجراء کا سہرا مولانا ابوالحسن علی ندویؒ ہی کے سر جاتا ہے۔

مولانا کی علمی کاوشوں پر نظر ڈالی جائے تو ایک حیرت انگیز تنوع کا احساس ہوتا ہے۔ انہوں نے

قرآن، حدیث، سیرت، فقہ، تاریخ، سوانح، تعلیم، تہذیب وغیرہ جیسے اہم موضوعات پر مضامین لکھے ہیں۔ان کی تصنیفات اور نگارشات ادبی، علمی، فکری اور معنوی اعتبار سے نہایت گراں قدر اور بلند پایہ ہیں۔مولانا کی قلمی تگ وتاز کا ایک شعبہ علامہ اقبالؒ کے فکر وفن کا مطالعہ بھی ہے۔ مولانا نے ''روائع اقبال''کتاب لکھ کر عالم عرب میں اقبال کا تعارف کرایا۔یہی کتاب ''نقوش اقبال'' کے نام سے اردو میں شائع ہو کر قبول عام حاصل کر چکی ہے۔رشید احمد صدیقی نے لکھا ہے کہ مولانا ابوالحسن ندویؒ پہلے عالم دین ہیں جنھوں نے موجودہ صدی کی اردو شاعری کے سب سے بڑے نمائندہ اور عظیم شاعر علامہ اقبالؒ کی شاعری اور شخصیت کا مطالعہ غیر معمولی شوق اور بصیرت سے کیا ہے[۱۸]۔ مشہور شاعر اور ادیب ماہر القادری صاحب ''نقوش اقبال'' کے متعلق لکھتے ہیں : ''کتاب پڑھتے وقت ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے شبلی کا قلم، غزالی کی فکر اور ابن تیمیہ کا جوش واخلاص اس تصنیف میں کار فرما ہے''[۱۹]۔

الغرض مولانا ابوالحسن علیؒ ایک صاحب طرز انشاپرداز ادیب تھے۔آپ نے اردو ادب کی ہر صنف میں اپنی گراں قدر تصانیف سے اضافہ کیا۔انھوں نے ایسے سفر نامے مرتب کیے کہ ابن بطوطہ، مسعودی، بیرونی اور ابن جبیر کی یاد تازہ کردی۔خاکے لکھے تو ایسے کہ اردو کا سقراط اور بقراط نظر آئے۔ایسی خود نوشت لکھی کہ پڑھنے والے کے دل میں ویسی ہی زندگی جینے کی تمنا جاگ اٹھے۔مولانا ابوالحسن علی ندوی بھی اقبال کی طرح مغربی طوفان کے لئے ایک چٹان کی مانند تھے۔ مولانا کی شخصیت میں مشرقی تہذیب، ثقافت اور علوم کی جڑیں بہت مضبوط تھیں، اور انہیں مشرقی تہذیب وثقافت کی رفعت اور عظمت پر اتنا یقین تھا کہ مغرب کو درخور اعتنا نہیں سمجھتے تھے۔ مولانا کا ادبی ذوق انتہائی شستہ اور شائستہ تھا۔ان کی تحریروں میں میرؔ، غالبؔ، مومنؔ، فیضؔ اور جگرؔ کے اشعار چمکتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

مولانا ابوالحسن ندوی کے بعد ہندوستان میں تحریک اسلامی ادب کو آگے بڑھانے میں ان کے شاگردوں کا بہت اہم رول رہا ہے۔ان میں ایک اہم نام پروفیسر محسن عثمانی کا ہے۔ وہ اردو اور عربی

۱۸۔ ابو الحسن علی ندوی، نقوش اقبال (مقدمہ از رشید احمد صدیقی)، مجلس تحقیقات ونشریات اسلام لکھنؤ، ۱۹۹۴ء، ص: ۱۶۔

۱۹۔ ابوالحسن علی ندوی، ماخذ سابق، ص: ۱۴۔

زبان کے ماہر انشاء پرداز ہیں۔ وہ ناقد، صحافی اور پچاس سے زیادہ کتابوں کے مصنف ہیں۔ وہ ایک صاحب اسلوب ادیب ہونے کے ساتھ ساتھ اسلامی اسکالر بھی ہیں۔ ان کے علمی اور فکری مضامین ہندوستان میں بہت شوق ودلچسپی سے پڑھے جاتے ہیں۔ خواص کا ایک بہت بڑا حلقہ ان کے افکار و نظریات سے بے حد متأثر نظر آتا ہے۔ ان کی تحریر کا اسلوب بہت دلکش ہے۔ اسلامیات ولسانیات کے علاوہ سفر نامے، انشاء پردازی، کالم نگاری کے ساتھ ساتھ ملی اور دینی اور عالمی مسائل کے موضوعات پر بھی مسلسل لکھتے رہتے ہیں۔ علمی اور فکری مضامین کے علاوہ انہوں نے تحقیق و تنقید کے میدان میں بھی کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں۔ ان کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ ''مطالعۂ شعر و ادب'' کے عنوان سے شائع ہو چکا ہے۔ پروفیسر عبدالحق صاحب نے اس کتاب کے تعارف میں لکھا:

> محسن عثمانی کے تجزیہ میں فن پاروں کا تہذیبی تفکر ایک نئی بصیرت کی نشاندہی کرتا ہے جسے تنقیدی عمل کا حاصل کہہ سکتے ہیں۔ ادب کی تدریس و ترسیل میں اس گریز پائی کی گنجائش نہیں ہے۔ پروفیسر محسن عثمانی نے ادبی انتقاد کے اصل الاصول کی پیشکش کو دلکشی بخشی ہے۔ ''مطالعہ شعر و ادب'' کے سترہ مضامین جہاں تنقیدی رویہ کے ضامن ہیں وہیں شخصیات، ادبی تحریکات، تصنیفات اور نگارشات کی درجہ بندی کا حق بھی ادا کرتے ہیں۔ ان مضامین میں بعض ادب اسلامی کے نظریہ کے بارے میں ہیں۔ بعض ادبی شخصیتوں کے بارے میں اور بعض ادب کے مسائل اور اصناف کے سلسلہ میں ہیں اور بعض میں کچھ اہم کتابوں کا جائزہ ہے۔ شخصیات میں اقبال کو کئی مضامین میں موضوع گفتگو بنایا گیا ہے۔ ان مضامین کا اسلوب شبلی اسکول کا بہترین نمونہ ہے[۲۰]۔

پروفیسر محسن عثمانی قدیم صالح وجدید نافع کے علم بردار دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کے فیض یافتہ ہیں، اور ہندوستان کی عظیم دینی درسگاہ دارالعلوم دیوبند سے دورۂ حدیث کی تعلیم مکمل کی۔ وہاں کے علماء اور کہنہ مشق فقہاء سے کسب فیض کیا۔ انہوں نے اپنی فکر و تحریر اور درد وسوز سے پورے ہندوستان کو متأثر کیا ہے۔ ان کی تحریروں میں دین اسلام کی جامعیت اور گہری فکر پنہا ہوتی ہے، ان کی نگارشات ایمان ویقین، عزم واستقلال اور صبر واستقامت کا درس دیتی ہیں۔ آپ کی تصنیفات اور مضامین ادب اسلامی کے میدان میں انمول اضافہ ہے۔ ان کی تحریروں میں مثنوی کا ساز، اقبال کی بلند حوصلگی، ایمانی محبت، شاہین کی پرواز، امت مسلمہ کے لئے لائحہ عمل ہوتا ہے۔ آپ کی تصنیفات کو ہر عام

۲۰۔ محسن عثمانی، پروفیسر، مطالعہ شعر وادب، (مقدمہ از پروفیسر عبدالحق) قاضی پبلشرز اینڈ ڈسٹری بیوٹرز، نئی دہلی، ۲۰۰۱ء، ص: ۱۳

وخاص میں قبول عام حاصل رہا ہے۔ آپ کے ادبی تصنیفات میں ''مطالعہ شعر وادب''، ''مشاہیر شعر وادب''، ''کلیم احمد عاجز: شخصیت اور شاعری''، ''مصر کی عربی صحافت''، ''اردو زبان کا تحفظ اور ہماری ذمہ داریاں''، ''کتابوں کے درمیان''، ''مشاہیر علوم اسلامیہ''، ''مشاہیر سائنس داں'' اور ''مشاہیر خواتین اسلام'' قابل مطالعہ ہیں۔

اقبالیات کے حوالے سے پروفیسر عبد الحق قابل ذکر ہیں۔ انھوں نے ''اقبالیات کا تنقیدی جائزہ'' کے موضوع پر تحقیقی مقالہ سپرد قلم کیا ہے۔ اس کا ایک باب ''اقبال کے ابتدائی افکار'' کے عنوان سے کتابی شکل میں شائع ہوا ہے۔ اقبال اور اقبالیات پر ان کی متعدد کتابیں شائع ہو چکی ہیں اور ہر جگہ ان کا تعمیری ذہن اور اخلاقی نقطۂ نظر پوری طرح نمایاں ہے۔ ماضی قریب میں ان کی ایک کتاب ''اقبال اور اقبالیات'' کے عنوان سے شائع ہوئی ہے اور اقبال شناس قارئین سے داد و تحسین حاصل کر چکی ہے۔ ''تصورات'' اور ''تحقیق'' ان کی دو اہم تنقیدی تصانیف ہیں جن سے ان کے تعمیری فکر و فن کی بھرپور عکاسی ہوتی ہے۔

معاصرین شعراء میں ڈاکٹر تابش مہدی بہت اہمیت کے حامل ہیں۔ وہ ایک ممتاز محقق اور خوش گو شاعر ہیں۔ نعتیہ شاعری میں انھیں نمایاں حیثیت حاصل ہے۔ تابش مہدی کی نعتوں اور غزلوں کے مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ نثر و نظم میں آپ کی پندرہ کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ ''اردو تنقید کا سفر، جامعہ ملیہ کے تناظر میں'' تابش صاحب کا گراں قدر تحقیقی مقالہ ہے، جو ۱۹۹۱ء میں شائع ہوا۔ اس میں مقالہ نگار نے اپنی بہترین تحقیقی واستدلالی صلاحیت کا مظاہر کیا ہے۔ ڈاکٹر تابش مہدی کے کلام کا اکثر و بیش تر حصہ نبی پر نور ﷺ کی شان اقدس میں ہے۔ بڑے بڑے دینی اور اسلامی جلسوں اور کانفرنسوں میں نعتیہ کلام پیش کرنے کے لئے انھیں مدعو کیا جاتا ہے، اور ان کے اشعار اور قصائد کو قدر کی نگاہوں سے پڑھا اور سنا جاتا ہے۔

اگر صحافیوں کی بات کی جائے تو معاصرین میں عطا عابدی اسلامی فکر سے وابستہ صحافی نظر آتے ہیں۔ وہ کہنہ مشق شاعر اور تنقید نگار ہیں، ان کی کئی کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ ان کی ایک مشہور کتاب ''بیاض'' غزلوں کا مجموعہ ہے اور ان کی ایک دوسری کتاب ''عکس عقیدت'' حمد و نعت پر مشتمل ہے۔ ان کی ایک اور تیسری کتاب ''مطالعہ سے آگے'' ادبی و تنقیدی مضامین اور تبصروں کا مجموعہ ہے۔ آپ نے ایک معتبر شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ اچھے تنقید نگار کی حیثیت سے بھی اپنی شناخت قائم کرلی ہے۔

ہندوستان میں تحریک ادب اسلامی کے روح رواں شاہ رشاد عثمانی ہیں، جو ادارہ ادب اسلامی کی کمان سنبھالے ہوئے ہیں۔ ہندوستان میں اسلامی ادب سے متعلق ان کی جدوجہد لائق رشک ہے۔ انہوں نے اردو کی نعتیہ شاعری کو اپنے تحقیقی و تنقیدی مطالعہ کا خصوصی موضوع بنایا ہے۔ انہوں نے اسلامی ادب سے متعلق بہت سی کتابیں لکھی ہیں۔ ان کی ایک کتاب کا نام "ادب کا اسلامی تناظر" ہے، جس میں اسلامی ادب سے متعلق قیمتی مضامین ہیں، اور دوسری کتاب "تعبیر و تشکیل" کے عنوان سے ہے جو تنقیدی مضامین پر مشتمل ہے۔

جنوبی ہند کی سرزمین بھی اسلامی ادب کے حوالے سے بڑی زرخیز ہے۔ بے شمار شعراء اور ادباء نے اسلامی ادب کے تطور اور ارتقاء کے لئے نمایاں کارنامے انجام دیے ہیں۔ خصوصاً شہر حیدرآباد کو اردو ادب میں منفرد مقام حاصل ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اردو کی کئی اصناف کا آغاز اسی سرزمین سے ہوا۔ حیدرآباد کے حکمرانوں کو اردو ادب سے کافی شغف تھا، ادیبوں کی سرپرستی ان کا شیوہ تھا۔ یہاں کی خاک سے بے شمار شعراء اور ادباء نے جنم لیا، جنہوں نے ہر دور میں اردو زبان کی آبیاری کی اور اپنی علم دوستی اور دانشورانہ صلاحیتوں سے پوری دنیا میں اپنا نام روشن کیا۔ آج بھی حیدرآباد میں اسلامی ادب اور اردو ادب کے فروغ اور ارتقاء میں جنوبی ہند کے شعراء کرام اور ادباء سرگرم عمل ہیں۔ حیدرآباد کی اردو اکیڈمی اس حوالے سے سارے ملک میں منفرد پہچان رکھتی ہے۔

دکن کے شعراء میں ڈاکٹر محمد حسین ایک کہنہ مشق ادیب اور ممتاز شاعر ہیں۔ صوبہ کرناٹک کے مشہور و معروف شہر بھٹکل سے ان کا تعلق ہے۔ مولانا محمد فاروق ندوی اور مولانا محمد الیاس ندوی بھی ان ادباء میں سے ہیں جنہوں نے اسلامی ادب سے اپنے کاوشوں کو وابستہ کیا، اپنی تصنیفات اور سفرناموں کو سیرت طیبہ اور تاریخ اسلام کے واقعات سے مزین کیا۔ خالد عرفان مرحوم کرناٹک کے معروف ادیب، نقاد مترجم اور ادب اطفال کے کامیاب قلمکار تھے۔ تحریک ادب اسلامی سے ان کی عملی وابستگی ان کی ہر تخلیق میں موجود ہے۔ "جذب واحتساب" ان کے ۱۵ ؍ تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے۔ آپ کی دلچسپی کا دائرہ خاصہ وسیع تھا۔ اس کتاب میں جہاں ادبی میلانات اور نظریات پر مضامین ہیں، وہیں ادب اطفال سے وابستہ قلمکاروں اور مزاح نگاروں کے ساتھ ساتھ خواجہ حسن نظامی، میر تقی میر، اقبال، احمد ندیم قاسمی اور کرشن چندر کے فن سے متعلق نگارشات اور عملی تنقید کے کامیاب نمونے ہیں۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ ادب اسلامی کی تحریک کی ابتداء اگرچہ پاکستان سے ہوئی، لیکن ہندوستان

میں ادارہ ادب اسلامی کے نام سے اس کی نشاۃ ثانیہ ہوئی۔ ادارہ ادب اسلامی اپنے قیام کے ساتھ ہی صالح ادب کے فروغ کے لئے مسلسل سر گرم اور کوشاں ہے۔ تحریک ادب اسلامی گزشتہ نصف صدی سے اردو ادب میں تہذیبی اور فنی آداب و اقدار کے درمیان مکمل ارتباط قائم رکھے ہوئے ہے۔ اس نے ماضی میں بھی فن کی جمالیات کو فکر کے اخلاقیات سے ہم آہنگ کیا تھا اور آج بھی ادیب اپنے عہد کے سنگین ثقافتی اور اقتصادی اور دینی حالات کو اپنا موضوع بنایا ہے۔ آج بھی نئی نسل کے باشعور ادباء اور شعراء خدا پرستی، انسان دوستی، تقوی و طہارت، ظلم کی مخالفت اور مظلوم کی حمایت کے اعلی اور ارفع جذبات سے سرشار ہیں، اور منظم جدوجہد کر رہے ہیں۔

مراجع و مصادر:

۱۔ تبسم کاشمیری، ڈاکٹر، اردو ادب کی تاریخ، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۳ء۔

۲۔ محمد حسن عسکری، ہمارا ادبی شعور اور مسلمان، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۴ء۔

۳۔ شبلی نعمانی، کلیاتِ شبلی اردو، دار المصنفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ، یوپی، ۲۰۰۷ء۔

۴۔ افتخار احمد صدیقی، ڈاکٹر، کلیات نظم حالی، مجلس ترقی ادب، لاہور، جنوری، ۱۹۷۰ء۔

۵۔ محمد زکریا، خواجہ، ڈاکٹر، اکبر الہ آبادی: تحقیقی و تنقیدی مطالعہ،، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۸۰ء۔

۶۔ غلام حسین ذوالفقار، ڈاکٹر، مولانا ظفر علی خان: حیات و خدمات و آثار، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۳ء۔

۷۔ رفیع الدین ہاشمی، اقبال کی طویل نظمیں، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۸۰ء۔

۸۔ انور سدید، ڈاکٹر، اردو ادب کی تحریکیں، انجمن ترقی اردو، کراچی، ۱۹۸۵ء۔

۹۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، تاریخ ادب اردو (جلد دوم، حصہ دوم)، ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس، دہلی، ۲۰۱۲ء۔

۱۰۔ فروغ احمد، پروفیسر، جدید اسلامی ادب کا تاریخی پس منظر، ماہنامہ، سیارہ،، لاہور، ستمبر ۱۹۹۵ء۔

۱۱۔ وحید قریشی، ڈاکٹر، اردو نثر کے میلانات، مکتبہ عالیہ، لاہور، ۱۹۸۶ء۔

۱۲۔ ابو الحسن علی ندوی، نقوش اقبال (مقدمہ از رشید احمد صدیقی)، مجلس تحقیقات و نشریات اسلام لکھنؤ، ۱۹۹۴ء۔

۱۳۔ محسن عثمانی، پروفیسر، مطالعہ شعر و ادب، (مقدمہ از پروفیسر عبد الحق) قاضی پبلیشرز اینڈ ڈسٹری بیوٹرز، نئی دہلی، ۲۰۰۱ء۔

۱۴۔ شاہ رشاد عثمانی، ادب کا اسلامی تناظر، اپلائیڈ پبلی کیشنز، نئی دہلی، ۱۹۹۹ء۔

وجودِ زن سے ہے تصویرِ کائنات میں رنگ

ڈاکٹر محمد امین میر

اقبال انسٹی ٹیوٹ آف کلچر اینڈ فلاسفی، کشمیر یونیورسٹی، سری نگر
meerameenamu@gmail.com

علامہ اقبال نے اگرچہ تصور نسواں کے حوالے سے کوئی مخصوص تحریر نہیں لکھی ہے لیکن ان کے مختلف شعری و نثری سرمایہ کو مربوط کر کے اگر دیکھا جائے تو ایک مکمل تصور سامنے آتا ہے۔ انہوں نے ۷، جنوری ۱۹۲۹ء کو مدراس میں ''انجمن خواتین اسلام مدراس'' کے سپاس نامہ کے جواب میں ''اسلام میں عورت کا مقام'' کے حوالے سے ایک بصیرت افروز تقریر کی۔ اپنے ایک مشہور لیکچر ''ملت بیضا پر ایک عمرانی نظر'' (علی گڑھ ۱۹۱۱ء) میں بھی متعدد جگہوں پر عورت کی عظمت و رفعت کے بارے میں وضاحت کی۔ ان کا ابتدائی مضمون ''قومی زندگی'' ہو یا پہلی تصنیف ''علم الاقتصادیات'' بھی اس حوالے سے کافی اہمیت کے حامل ہیں۔ Stray Reflection میں تصور نسواں کے حوالے سے ''تعدد ازدواج'' اور ''مسلمان عورت'' کے موضوعات پر بحثیں ملتی ہیں۔ اردو مجموعہ ''بانگ درا'' میں ''فاطمہ بنت عبداللہ''، ''والدہ مرحومہ کی یاد میں'' ''غلام قادر روہیلہ'' اور ''ماں کا خواب''، جیسی نظموں میں وجود زن کے مختلف کرداروں کی عکاسی نظر آتی ہے۔ ''ضرب کلیم'' میں تین رباعیوں کے علاوہ عورت کے عنوان سے ایک پورا باب جو تقریبا ۹ نظموں پر مشتمل ہے۔ جس میں ''مرد فرنگ''، ''ایک سوال''، ''پردہ''، ''خلوت''، ''عورت''، ''آزادئ نسواں''، ''عورت کی حفاظت''، ''عورت اور تعلیم''، ''عورت'' شامل ہے۔ اس کے علاوہ فارسی مجموعہ کلام ''ارمغان حجاز'' میں دختران ملت کے زیر عنوان تقریبا ۸، رباعیات، ''رموز بے خودی'' اور ''پس چہ باید کرد'' میں بھی متعدد جگہوں پر کم و بیش بہت سے نئے مسائل جیسے عورت کے تقدس کا مسئلہ مختلف صورتوں میں ملتا ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ انسانی معاشرے میں خواتین کی عظمت کا مسئلہ ہمیشہ سے رہا ہے اور ہر زمانے میں وقت کے مطابق اس کو حل کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اقبال بھی اس بات سے اتفاق کرتے ہیں:

ہزار بار حکیموں نے اس کو سلجھایا　　　مگر یہ مسئلۂ زن رہا وہیں کا وہیں
قصور زن کا نہیں ہے کچھ اس خرابی میں　　　گواہ اس کی شرافت پہ ہیں مہ و پرویں

کلام اقبال کے حوالے سے جب ہم اس مسئلے پر غور و فکر کرتے ہیں تو اقبال جس طرح سے اپنی زندگی کے بیشتر حصہ میں فلسفیانہ نقطۂ نظر میں اسلام اور تہذیب جدید کے نظریے کا تقابلی مطالعہ کرتے ہیں، اسی طرح وہ تصور نسواں کے نظریہ کو بھی پرکھتے ہیں۔ علامہ عورت کی ذہنی وادراکی قابلیتوں اور صلاحیتوں کے معترف نظر آتے ہیں۔ وہ مشرقی خواتین کو ان کے اقدار کی پاسداری اور عورت بحیثیت مصلح معاشرے کی اصلاح و فلاح میں کس طرح اہم کردار ادا کرسکتی ہے۔ دیکھنا چاہتے ہیں۔ اپنے مضمون ''قومی زندگی'' (اکتوبر ۱۹۰۴) میں وہ اس بات کا متعدد جگہوں پر ذکر کرتے ہیں کہ مرد کی تعلیم فرد واحد کی تعلیم ہے جب کہ عورت کو تعلیم دینا پورے خاندان کو تعلیم دینے کے مترادف ہے۔ اسی مضمون میں تمدنی اصلاح میں بطور خاص عورتوں کو تعلیم حاصل کرنے کی طرف اشارہ بھی کرتے ہیں۔ کیونکہ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ قوم میں تعلیم نسواں کی اشد ضرورت ہے اور ان کو اس بات کا بھی اندازہ ہے کہ دنیا کا آدھا حصہ اگر جاہل مطلق رہ جائے تو کوئی قوم ترقی نہیں کرسکتی۔ عورتوں کی تعلیم کے سلسلے میں لکھتے ہیں:

> عورتوں کی تعلیم سب سے زیادہ توجہ کی محتاج ہے۔ عورت حقیقت میں تمام تمدن کی جڑ ہے... پس ہمارے لیے یہ ضروری ہے کہ تمدن کی جڑ کی طرف اپنی توجہ مبذول کریں اور اپنی قوم کی عورتوں کو تعلیم کے زیور سے آراستہ کریں۔ مرد کی تعلیم صرف ایک فرد واحد کی تعلیم ہے مگر عورت کو تعلیم دینا حقیقت میں تمام خاندان کو تعلیم دینا ہے۔ دنیا میں کوئی قوم ترقی نہیں کرسکتی اگر اس کا آدھا حصہ جاہل مطلق رہ جائے۔[۱]

اقبال کے نزدیک عورتوں کا وجود انسان کے لیے لائقِ احترام و محبت ہے۔ قوموں اور ملتوں کی تعمیر ان کے بغیر ناممکن ہے:

ارجِ ما از ارجمندی ہائے او
ماہمہ از نقشبندی ہائے او

(جاوید نامہ)

(ہمارا وقار عورتوں کی سربلندی سے ہے۔ ہم سب انسانوں کا وجود عورت کے نقشبندی کے نتیجے میں ہے)۔

کلام اقبال میں وجود زن کے مختلف کردار نظر آتے ہیں۔ ''والدہ مرحومہ کی یاد میں''، جیسی

۱۔ تصدق حسین تاج، مرتب۔ مضامین اقبال، اعظم اسٹیم پریس مغل پورہ حیدر آباد ۱۳۳۶ھ ص۔ ۲۴

شاہکار نظم میں جب یہ عورت ماں کا کردار ادا کرتی ہیں تو اقبال تربیت اولاد میں عورت کی عظمت کو کچھ اس طرح بیان کرتے ہیں:

حیرتی ہوں میں تری تصویر کے اعجاز کا — رخ بدل ڈالا ہے جس نے وقت کی پرواز کا
تربیت سے تیری میں انجم کا ہم قسمت ہوا — گھر مرے اجداد کا سرمایۂ عزت ہوا
دفتر ہستی میں تھی زریں ورق تیری حیات — تھی سراپا دین و دنیا کا سبق تیری حیات
زندگانی تھی تری مہتاب سے تابندہ تر
خوب تر تھا صبح کے تارے سے بھی تیرا سفر

بانگ درا میں ''ماں کا خواب'' نظم میں ماں کی ممتا کو اپنے عروج پہ دکھایا گیا ہے۔ یہ ممتا کا کردار کسی بھی حال میں اپنے بچے کی جدائی برداشت نہیں کر پاتی۔ آپ اس نظم کے چند اشعار میں یہ خود محسوس کر سکتے ہیں:

اسی سوچ میں تھی کہ میرا پسر — مجھے اس جماعت میں آیا نظر
وہ پیچھے تھا اور تیز چلتا نہ تھا — دیا اس کے ہاتھوں میں جلتا نہ تھا
کہا میں نے پہچان کر میری جاں! — !مجھے چھوڑ کر آگئے تم کہاں
جدائی میں رہتی ہوں میں بے قرار — پروتی ہوں ہر روز اشکوں کے ہار
نہ پروا ہماری ذرا تم نے کی
گئے چھوڑ، اچھی وفا تم نے کی

اب ذرا تہذیب جدید کی ماں کی صورت حال کا جائزہ لیجیے، جسے ''آزادی نسواں'' کے نام پر زیب وزینت، بے پردگی اور بیباکی کی طرف مائل کیا گیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ آج کل معاشرے میں یہ حالت ہے کہ ماؤں کے لیے اولاد بوجھ بن گئی ہے اور اولاد اپنے والدین کو بوجھ سمجھتے ہیں۔ اور اسی طرح حمل گرانے اور روکنے جیسی مختلف صورتیں اختیار کر کے وہ ماں کے رحم میں پرورش پانے والے بچوں کے وجود کو اندر ہی ختم کر دیتے ہیں۔ آج کی صورت حال کو مد نظر رکھتے ہوئے اقبال کے ان اشعار کو ملاحظہ کیجیے:

دیدۂ با بے نم ز حب سیم و زر — مادراں را بارِ دوش آمد پسر
تا نیارد زخمہ از تارش سرود — می کشد نازادہ را اندر وجود

''فاطمہ بنت عبداللہ''، جیسی نظم میں ایک بے باک اور ممتاز صفت کا حامل کردار جب جنگ طرابلس

میں شہیدوں کو پانی پلاتی ہوئی شہید ہو جاتی ہے تو شاعر کا دل اس قربانی اور سچے جذبے کی آنچ سے تڑپ اٹھتا ہے۔اس کے تصور میں اس لڑکی کی وجہ سے کائنات کا ذرہ ذرہ جگمگا اٹھتا ہے:

فاطمہ! تو آبروئے امتِ مرحوم ہے ذرہ ذرہ تیری مشت خاک کا معصوم ہے

حور صحرائی، تری قسمت میں تھی یہ سعادت غازیانِ دیں کی سقّائی تری قسمت میں تھی

رقص تیری خاک کا کتنا نشاط انگیز ہے!

ذرہ ذرہ زندگی کی سوز سے لبریز ہے

انہیں شہیدوں کا خون جب اقبال ''حضور رسالت مآب''میں بطور تحفہ لے جاتے ہیں تو اس خون کی قیمت ان الفاظ میں پیش کرتے ہیں:

مگر میں نذر کو اک آبگینہ لایا ہوں جو چیز اس میں ہے، جنت میں بھی نہیں ملتی

جھلکتی ہے تری امت کی آبرو اس میں طرابلس کے شہیدوں کا ہے لہو اس میں

علامہ اقبال کے بے غیرت و بے حمیت عورت کے کردار کا اندازہ ''غلام قادر روہیلہ'' نظم سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔ جس میں غلام قادر روہیلہ شاہی بیگمات کے ناچنے کے دوران دکھاوے کی نیند سو جاتا ہے صرف اس لیے کہ وہ تیموری شاہی بیگمات کی غیرت و حمیت دیکھ سکے لیکن اسے ان کے اندر کوئی تیموری خاندان والی صفت نظر نہیں آتی۔اقبال نے اس واقعے کو کس طرح سے اپنی شعری پیکر میں سمویا ہے اس کا اندازہ آپ خود لگائیں:

مرا مسند پہ سو جانا بناوٹ تھی تکلف تھا کہ غفلت دور ہے شانِ صف آرایانِ لشکر سے

یہ مقصد تھا مرا اس سے کوئی تیمور کی بیٹی مجھے غافل سمجھ کر مار ڈالے میرے خنجر سے

مگر یہ راز آخر کھل گیا سارے زمانے پر

حمیت نام ہے جس کا گئی تیمور کے گھر سے

علامہ اقبال اس چیز سے بخوبی واقف ہیں کہ جہاں ایک طرف قدیم معاشرے میں عورت کا مقام و مرتبہ ہر لحاظ سے قابل افسوس نظر آتا ہے، وہیں تہذیب جدید کے بطن سے بہت سے نئے نئے مسائل میں عورت کے تقدس کا مسئلہ مختلف صورتوں میں قابل تردید بھی ہے۔اسی طرح مختلف مذاہب و مختلف سماجوں و تہذیبوں میں بھی عورت انتہائی مظلوم و بے بس و مجبور نظر آتی ہے۔یہ کہنا بجا ہوگا کہ خواتین کے سماجی اور معاشرتی حقوق کی حیثیت سے مشرق اور مغرب کی صورت حال ایک

جیسی ہے۔ کہیں فرسودہ روایات کے تحت اس کے حقوق کی پاسداری نہیں ہوتی اور کہیں ترقی یافتہ سماج میں عورت جدید تعلیم اور آزادی نسواں کے نام پر مارکیٹنگ کی دنیا کی خرید وفروخت کا سامان بنا کرر کھ دی گئی ہیں اور سر بازار انہیں فحاشی اور عریانی کی بھینٹ چڑھایا جاتا ہے۔

جدید دور نے عورت کو آزادئ نسواں اور حقوق نسواں کا نعرہ تو ضرور دیا یا زندگی کے مختلف شعبوں میں انہیں آزادانہ کام کرنے کی اجازت اور سہولت بھی دی لیکن اگر غور کیا جائے تو لذت نفس کی تسکین کا ذریعہ اور سرمایے کے حصول کے لیے اس کے جسم کا استعمال کرکے اسے اس کی مرضی کا نعرہ دیا۔اس کے جسم کے مختلف اعضاء کو ننگا رکھنے کو اس کی آزادی سمجھا جانے لگا۔لذت کوشی کے نئے طریقے اختیار کر لیے گئے۔انہوں نے عورت کو ایک طرف ننگا کر دیا اور پھر اسے تجارتی جنس کے طور پر استعمال کیا۔ بھلے ہی زندگی کے کسی شعبے میں عورت کو دخل دینے کی اجازت ہو لیکن مختلف شعبہ ہائے زندگی سے متعلق مارکیٹنگ کرنے کے لیے عورت کا کردار متعین کیا گیا ہے۔ یہ عناصر عورت کے لیے باعث ذلت اور تحقیر ہی قرار دیے جاسکتے ہیں۔ لہٰذا یہ کہا جاسکتا ہے کہ دونوں معاشروں میں جہاں ایک طرف مذہب، قانون اور سماج کے نام پر جاہلانہ روایات کی عورت کی پاسداری کو ہی سب کچھ سمجھ لیا گیا ہے وہیں دوسرے معاشرے میں آزادی کے نام پر اپنی نفسانی ہوس پرستی کے لیے ایک آلہ کے طور پر اس کا استعمال قدر مشترک ہے۔انسانی تاریخ کا یہ بڑا المیہ ہے کہ اس میں عورت کے حقوق کو بالائے طاق رکھا جاتا ہے۔ یہ بات غور طلب ہے کہ اس سے قبل عورت کو لذت تسکین کے لیے مختلف طریقوں سے استعمال کیا جاتا تھا اور آج کل اسے نئی صورت میں استحصال کیا جاتا ہے جسے آج کل کے معاشرے میں آزادی نسواں کا نام دیا جاتا ہے۔علامہ اقبال اس تہذیب کے باطن میں جب جھانک کر دیکھتے ہیں تو سوائے یاس وناامیدی اور تاریکی کے اور کچھ نظر نہیں آتا، کیونکہ جس معاشرے میں انسان اپنی نفسانی خواہشات کی تکمیل کا حریص ہو، نفس کی خواہشات کو پورا کرنا اس کا اولین مقصد زندگی ہو تو ایسے معاشرہ میں برائی ہی جنم لیتی ہے۔آج پوری دنیا میں مردوں نے اپنی عیش پرستی اور جنسی بے راہ روی کی تسکین کے لیے عورت کو گھر سے باہر نکالا اور عورتوں کے رشتوں سے آزاد ہونے کو اپنی انفرادی زندگی کا نام دیا۔علامہ اقبال نہ صرف یہ کہ مغرب کو عورت کی عظمت کی پامالی کے حوالے سے تنقید کا نشانہ بناتے ہیں بلکہ عورت کے مقام و احترام اور اس کی حیثیت کو عشوہ وناز وادا کے طریقے سے یا صرف عورت کے ایک رخ سے پیش کرنے پر اور ادب کی بلندگی اور مقصدیت کو فراموش کرکے ساری دنیا کے شاعروں اور عموماً ہندوستان

کے شاعروں کو تنقید کا نشانہ بناتے ہیں۔اقبال کے یہ اشعار ملاحظہ کیے جا سکتے ہیں:

چشمِ آدم سے چھپاتے ہیں مقاماتِ بلند کرتے ہیں روح کو خوابیدہ، بدن کو بیدار

ہند کے شاعر و صورت گر و افسانہ نویس آہ! بیچاروں کے اعصاب پہ عورت ہے سوار!

ہنر ورانِ ہند (ضرب کلیم)

علامہ اقبال نے جس طرح سے اپنے مخصوص نظریے کے آئینے میں مختلف کلاسیکی تصورات کو ایک نیا آہنگ دیا اسی طرح تصور عورت کے حوالے سے بھی ان کا روایت اور جدیدیت کا ایک حسین امتزاج نظر آتا ہے۔آپ خود اندازہ لگا سکتے ہیں وہ کس طرح ما قبل کے شعراء کی عام روش سے ہٹ کر اپنے مخصوص نظریے کے آئینے میں عورت کا ایک نیا تصور لاتے ہیں۔وجود زن کے بغیر یہ دنیا بے رنگ و کیف ہے۔اس کی عظمت اور شرف و منزلت کا مقام اتنا بلند ہے کہ اس کی مشت خاک ثریا سے بڑھ کر ہے۔میرے خیال میں ابھی تک پوری اردو شاعری میں عورت کے مقام و مرتبہ کو اور اس کے تقدس کو اس طرح پیش نہیں کیا گیا ہے۔عورت کے مقام و مرتبہ کو اقبال کس طرح بیان کرتے ہیں ملاحظہ کیجیے؛

وجودِ زن سے ہے تصویرِ کائنات میں رنگ اسی کی ساز سے ہے زندگی کا سوزِ دروں

شرف میں بڑھ کے ثریا سے مشتِ خاک اس کی کہ ہر شرف ہے اسی درج کا درِ مکنوں!

مکالماتِ فلاطوں نہ لکھ سکی لیکن

اسی کے شعلے سے ٹوٹا شرارِ افلاطوں

عورت (ضرب کلیم)

دراصل اقبال کے نزدیک عورت اپنی زندگی کے جس مرحلے میں ہوتی ہے عملی اور فکری طور پر ملک و معاشرہ اور قوم و ملت کو عظمت و رفعت فراہم کرتی ہے۔خاندان اور سماج میں ماں، بہن، بیوی اور بیٹی کا وجود نہایت اہمیت کا حامل ہوتا ہے۔لیکن موجودہ دور کے عناصر عورت کے لئے باعث ذلت اور تحقیر ہی ہیں۔اقبال اگرچہ تعلیم نسواں کو قومی ترقی کے لیے اہم ستون قرار دیتے ہیں لیکن ان کے نزدیک جو علم عورت کو اپنے مقام اور اقدار کی حیثیت سے دور کرے تو وہ علم موت کے مترادف ہے:

تہذیب فرنگی ہے اگر مرگِ امومت ہے حضرتِ انساں کے لیے اس کا ثمر موت!

جس علم کی تاثیر سے زن ہوتی ہے نازن کہتے ہیں اسی علم کو اربابِ نظر موت!

بیگانہ رہے دیں سے اگر مدرسۂ زن
ہے عشق و محبت کے لیے علم و ہنر موت!

ضربِ کلیم (عورت اور تعلیم)

جدید دور کی تعلیم نسواں اور آزادئ نسواں کے نتائج کا اندازہ علامہ اقبال کے اس اقتباس سے بھی لگایا جا سکتا ہے جو انھوں نے آج سے برسوں قبل پیش کیا تھا۔ یہ نقطۂ نظر آج کی صورت حال میں بھی نہ صرف یہ کہ اپنی معنویت رکھتا ہے بلکہ وقت کے بدلنے کے ساتھ اس معنویت میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے:

مغربی دنیا میں جہاں نفسی نفسی کا ہنگامہ گرم ہے اور غیر معتدل مسابقت نے ایک خاص قسم کی اقتصادی حالت پیدا کر دی ہے، عورتوں کا آزاد کر دیا جانا ایک ایسا تجربہ ہے جو میری دانست میں بجائے کامیاب ہونے کے الٹا نقصان رساں ثابت ہوگا اور نظامِ معاشرت میں اس سے بے حد پیچیدگیاں واقع ہو جائیں گی اور عورتوں کی اعلی تعلیم سے بھی جس حد تک کہ افراد قوم کی شرح ولادت کو تعلق ہے جو نتائج مرتب ہوں گے وہ بھی غالباً پسندیدہ نہ ہوں گے۔ مغربی دنیا میں جب عورتوں نے گھر کی چار دیواروں سے باہر نکل کر کسب معاش کی جدوجہد میں مردوں کا ساتھ دینا شروع کیا تو خیال یہ کیا جاتا تھا کہ ان کی یہ اقتصادی حریت دولت کی پیداوار میں معتد بہ اضافہ کرے گی لیکن تجربے نے اس خیال کی نفی کر دی اور ثابت کر دیا کہ اس خاندانی وحدت کے رشتے کو جو بنی نوع انسانی کی روحانی زندگی کا جزو اعظم ہے یہ حریت توڑ دیتی ہے۔[۲]

۲۔ علامہ اقبال، تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ، مترجم سید نذیر نیازی، اسلامک بک سینٹر کلاں محل نئی دہلی ۱۹۸۶ء ص ۱۲

اخبار علمیہ

قوموں کے مابین لفظوں کے معانی میں اختلاف

قوموں کے درمیان لفظوں کے مابین اختلاف ہوتا ہے یعنی ایک لفظ ایک جگہ کسی مفہوم میں استعمال ہوتا ہے اور وہی لفظ دوسری جگہ دوسرے معنی میں بولا جاتا ہے مگر تعبیروں میں اختلاف نہیں ہوتا۔ وہ ہر جگہ ایک جیسی ہی ہوتی ہیں۔ اس سلسلہ میں ایک دلچسپ تحقیق عربی اخبار الریاض میں شائع ہوئی ہے۔ رپورٹ کے مطابق الفاظ کے معنٰی قوموں کے درمیان مختلف ہوتے ہیں اور یہ چہرے کے تاثرات کے برعکس ہوتے ہیں۔ لوگ خوشی اور غضب کے وقت اپنے چہرے سے جو تاثرات ظاہر کرتے ہیں وہ ہر جگہ ایک ہی جیسے ہوتے ہیں۔ سائنس دانوں نے نیوگینیا (Guinea) کے جزیرے میں الگ تھلگ قبائل پر سینکڑوں گھنٹے تحقیق کی اور ان پر اس کو منطبق کیا۔ تحقیق کا نتیجہ یہ سامنے آیا کہ خوشی کے وقت ان میں کسی نے اپنی پیشانی سکوڑی نہیں یا غصہ کے وقت تبسم یا مسکرانے جیسا چہرا نہیں بنایا۔ تحقیق کے دوران جب ان قبائل کو امریکیوں کی ایسی تصویریں جو خوف، خوشی یا کسی اور موقع پر کھینچی گئیں تھی دکھائی گئیں تو انہوں نے ان کو صحیح صورت میں پہچانا۔ اس سے یہی بات ثابت ہوتی ہے کہ جیسے کچھ شیر خوار بچے جو پیدائشی طور پر اندھے ہوتے ہیں اور اپنی ماؤں سے گفتگو کے وقت مسکراتے ہیں حالانکہ کو انہیں مسکراہٹ نظر نہیں آتی۔ معلوم ہوا کہ چہرے کے تاثرات فطری ہیں۔ لیکن لفظوں کے معانی ومفاہیم میں بڑے اختلافات ہیں۔ مثال کے طور پر انگریزی میں لفظ حیوان ان لفظوں میں ہے جس کا عربی میں ترجمہ اکثر مترجمین محاورہ کے طور پر کرتے ہیں یعنی اس کے لفظی معنٰی مراد نہیں لیتے۔ حیرت اس وقت ہوتی ہے جب فلم چل رہی ہو۔ اس وقت ایک شخص کو اپنے جگری دوست کو اس کی کسی خوبی کے سبب حیوان کہتے ہوئے سنا جاتا ہے اور ترجمہ کرنے والا اس کا ترجمہ ''صدیقی حیوان'' کرتا ہے۔ حالانکہ دوست نے اس کو وہاں حیوان کے معنی میں نہیں بولا ہے۔ پھر ایک شخص اپنے عزیز دوست کو اس صفت سے کیسے متصف کر سکتا ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ یہ ایک اصطلاحی لفظ ہے جس کا مطلب دونوں زبانوں میں کچھ اور ہے۔ عربی میں یہ ایک توہین وتضحیک آمیز لفظ ہے۔ انگریزی میں یہ ایک توہین آمیز لفظ ہو سکتا ہے جس کا مطلب ایک وحشی اور غیر مہذب شخص ہے اور یہ ایک ہی وقت میں زبردست طاقتور شخص کی تعریف کے لیے بھی ہو سکتا ہے۔ عربی میں ایسے شخص کے لیے سب سے صحیح لفظ ''وحش'' ہے۔ اسی طرح ایک اور لفظ ''کلب'' (کتا) ہے جو عربوں کے نزدیک توہین آمیز لفظ ہے لیکن مغرب کتوں سے محبت اور ان کی

تقدیس کرتا ہے۔اس کے باوجود یہ لفظ ان کے یہاں منفی معنی رکھتا ہے۔اگر کسی کو ''کتا'' سے تعبیر کیا جائے تو اس سے مراد وہ شخص ہوتا ہے جو اپنے جذبات کو نہیں دباتا یا اپنے نزولات (خواہشات وجذبات) پر قابو نہیں پاتا۔الفاظ تو وہی ہیں لیکن ثقافتوں نے ان کے معنی بدل دیے۔(الریاض ۷ ستمبر ۲۲ء ص ۲۰)

لکھنؤ میں ابتدائی اردو صحافت کے متعلق ڈاکٹر روی بھٹ کے خیالات

ڈاکٹر روی بھٹ (مصنف ''دی لائف اینڈ ٹائمز آف دی نوابز آف لکھنؤ'')،ٹائمز آف انڈیا میں لکھنؤ کی قدیم صحافت کے متعلق لکھتے ہیں کہ شعرائے لکھنؤ جیسے امام بخش ناسخ، حیدر علی آتش اور دیگر ادبا نے اردو ادب کی ترقی میں اہم رول ادا کیا ہے۔وہاں کے اسلوب کو لکھنؤ اسکول آف لٹریچر کہا جاتا تھا۔اردو کا پہلا اخبار جام جہاں نما ۱۸۲۲ء میں کلکتہ سے ہریہر دتّہ نے جاری کیا تھا۔اسی دور میں لکھنؤ میں اردو صحافت نے مزید بلندیوں کو چھوا۔علامہ یوسف علی کے مطابق یہ ۱۸۵۷ء کی بات ہے جب لکھنؤ سے ''طلسم لکھنؤ'' کے نام سے ایک اخبار شائع ہوا تھا۔۱۸۵۹ء میں ایک مشہور ناشر ادارہ کے مالک منشی نول کشور نے اودھ اخبار شروع کیا۔اس اخبار میں ادبی مضامین کے لیے خصوصی صفحات تھے اور اردو صحافت میں ان دنوں کے سب سے معزز ناموں میں سے ایک پنڈت رتن ناتھ سرشار نے ۱۸۵۸ء سے ۱۸۹۴ء تک ۱۶ سال اس کی ادارت کی۔آغا مہدی کے مطابق یہ اخبار ۱۹۴۴ء تک نکلتا رہا۔اس کی مقبولیت سے حوصلہ پاکر نول کشور نے ایک ہلکا پھلکا ماہانہ مزاحیہ رسالہ ''تفریح'' بھی شروع کیا تھا۔تاہم اچھے معیار کے باوجود ۱۹۱۴ء میں بند کر دیا گیا۔وہاں سے ایک اور اخبار اودھ پنچ بھی شائع ہوتا تھا جو مزاحیہ تحریروں کے لیے وقف تھا۔اس کی ابتدا ۱۸۷۷ء میں ہوئی تھی۔اس کی بڑے پیمانہ پر اشاعت کا سہرا اس کے ایڈیٹر منشی سجاد حسین کو جاتا ہے۔وہ خود مزاح کے میدان کے نامور تھے اور اپنے عہد کے اہم لکھنے والوں ستم ظریف مرزا، مرزا مچھو بیگ، احمد علی شوق، شرر، تربھون ناتھ ہجر، جوالا پرساد برق، رام ناتھ سرشار، احمد علی کسمنڈوی اور اکبر الٰہ آبادی جیسے ادیبوں اور شاعروں سے جڑے ہوئے تھے۔اس کے ایڈیٹر کا نقطۂ نظر بہت سیکولر اور ترقی پسندانہ تھا اور جب معیار اور اس کے دائرۂ اشاعت کی بات آتی ہے تو یہ کہا جاتا ہے کہ اس وقت اردو کا کوئی دوسرا اخبار اودھ پنچ کے مماثل نہیں تھا۔۱۹۱۲ء میں ایڈیٹر سجاد حسین کی وفات کے بعد یہ اخبار بند کر دیا گیا تھا لیکن ۱۹۳۰ء میں حکیم ممتاز حسین عثمانی نے اسے دوبارہ شروع کیا۔(ٹائمز آف انڈیا، وارانسی ایڈیشن ۵ ستمبر ۲۲ء ص ۵) **ک، ص اصلاحی**

تبصرۂ کتب

خواتین کی ملازمت اسلامی اصولوں کی روشنی میں: ڈاکٹر عدنان باحارث۔ ترجمہ: ازہر رشید الاعظمی۔ کاغذ و طباعت عمدہ، غیر مجلد مع خوبصورت گرد پوش۔ صفحات :۲۳۸ ملنے کا پتہ: دار الثقافۃ الاسلامیۃ، مئو ۲۷۵۱۰۱۔ قیمت ۱۵۰ روپے۔ سن طباعت: ۲۰۱۸ء۔ موبائل نمبر و ای میل: درج نہیں۔

خواتین کی ملازمت کا مسئلہ شروع سے اہل علم و تحقیق اور صاحب فکر و نظر کی دلچسپی کا موضوع رہا ہے۔ ایک طبقہ پورے شد و مد سے عورتوں کی ملازمت کو ہر میدان میں صحیح سمجھتا اور اس بات کا قائل رہا ہے کہ اپنی زندگی کو بہتر اور ترقی یافتہ بنانے کے لیے وہ گھر کی دہلیز پار کر کے ملازمت کر سکتی ہے۔ دوسرا طبقہ اس کی آزادانہ ملازمت کو غلط اور مشروط و محدود دائرہ میں جہاں اس کی عفت و عصمت کی حفاظت کا موزوں ماحول ہو جائز خیال کرتا ہے۔ اسلام نے عورتوں کے نان نفقہ کی ذمہ داری مردوں پر عائد کی ہے اور عورتوں کو اس اہم ذمہ داری سے بری رکھا ہے لیکن بدرجۂ مجبوری اگر زندگی میں ایسے حالات پیدا ہو جائیں تو اس نے اس سلسلہ میں خاموشی اختیار نہیں کی ہے بلکہ عورتوں کی ملازمت کے ضابطے اور اصول بتائے ہیں جن کو پیش نظر رکھ کر وہ اس میدان میں اتر سکتی ہے۔ مسلمان عورتوں کا یہ بہت اہم مسئلہ ہے۔ زیر نظر کتاب میں اس مسئلہ کا نہایت عالمانہ، محققانہ اور حقیقت پسندانہ، قابل قبول اور کافی و شافی حل پیش کیا گیا ہے۔

اصلا یہ عربی تصنیف ضوابط تشغيل النساء کا اردو ترجمہ ہے۔ مصنف نے پہلے موضوع کی اہمیت، اس بحث کی پیچیدگی، اس کی اصطلاحات اور اس موضوع پر مشتمل سابقہ تحریروں پر ناقدانہ نگاہ ڈالی ہے۔ اس کے بعد کتاب کو چھ مباحث یعنی مرکزی عناوین اور پھر ہر بحث کو متعدد ضابطوں میں تقسیم کر کے معلومات کا احاطہ کیا ہے۔ تمہید کے بعد پہلی بحث خواتین کی ملازمت کے اخلاقی ضوابط، دوسری بحث خواتین کی ملازمت کے انسانی ضابطے، تیسری بحث صحت سے متعلق ضابطے، چوتھی عائلی ضابطے، پانچویں عورتوں کی ملازمت کے مخصوص اور امتیازی ضابطے اور چھٹی اور آخری بحث ان کی ملازمت کے احتیاجی ضابطے پر دینی اور اسلامی نقطۂ نظر کے ساتھ ساتھ عصری جائزوں بالخصوص سروے رپورٹوں کی روشنی میں گفتگو کی گئی ہے۔ کتاب کے آخر میں خاتمہ، خلاصۂ بحث اور سفارشات بھی بڑے کام کی چیزیں ہیں۔ ان کا مطالعہ کیے بغیر قاری کتاب کو رکھ نہیں سکتا۔ آخر میں تقریباً ۵۵ صفحات پر مشتمل فہرست مراجع درج کیا ہے۔ اس سے اس مسئلہ پر مصنف کے عمیق

مطالعہ اور اس موضوع پر جدید و قدیم مآخذ سے استفادہ کا علم ہوتا ہے۔

موجودہ متمدن اور تہذیب یافتہ معاشرہ میں خواتین کی ملازمت کے نتیجے میں پیدا ہونے والے مسائل اور خطرات کا تحلیل و تجزیہ کر کے اسلامی اور انسانی اصولوں کی روشنی میں حل پیش کیا گیا ہے۔ مصنف نے تلاش و تحقیق کا کوئی پہلو نہیں چھوڑا ہے۔ اس اہم مسئلہ کے مثبت پہلوؤں کے ادراک میں مصنف نے اپنی جس بصیرت اور منصفانہ رویہ کا ثبوت دیا ہے اس کے لیے دل سے دعا نکلنا لازمی ہے۔ عورت کی ملازمت شریعت نے کب، کیسے اور کن شرطوں کے ساتھ جائز قرار دیا ہے مصنف لکھتے ہیں "اگرچہ شریعت نے عورتوں کے لیے کام اور ملازمت کو اصولی طور پر جائز قرار دیا ہے تاہم اس کے ساتھ کچھ ضابطے اور شرطیں بھی مقرر کر دی ہیں جو کام کے اختیار کرنے کا فیصلہ کرتی ہیں۔ جیسے کام کا بذات خود جائز ہونا، عورت کے لیے کام کی نوعیت اور اس کی حاجت، سرپرست کی اجازت، گھر کی مصلحت، عورت کی صحت کی سلامتی اور فتنہ سے اس کی حفاظت نیز کام کے لیے نسوانی خدمات کی ضرورت۔" (ص ۱۷۱- ۱۷۲) کتاب کے مشمولات اور اس فن پر جدید عربی عبارتوں کے سلیس اردو ترجمہ کے لیے مترجم مبارک باد اور اہل اردو کے شکریہ کے مستحق ہیں۔

اوراق مجموعہ غزل: رباب رشیدی۔ کاغذ و طباعت عمدہ، مجلد مع خوبصورت گرد پوش، صفحات ۲۶۴، ملنے کا پتہ: رباب رشیدی، ۱۲۶ تازی خانہ، پوسٹ آفس امین آباد، لکھنؤ۔ ۱۸۔ قیمت: ۳۰۰ روپے۔ سن طباعت: ۲۰۲۰ء۔ موبائل نمبر: ۷۹۹۲۱۰۸۵۷۲

لکھنؤ کی قدیم تہذیب اور وہاں کا ماحول شروع سے غزلوں کے لیے سازگار رہا ہے۔ گو کہ اب وہ زمانہ اور ماحول نہیں رہا اور قدریں بھی بہت کچھ بدل گئی ہیں تاہم جناب رباب رشیدی صاحب جیسے شاعر آج بھی موجود ہیں جن کے کلام کا معیار اعلیٰ اور جن کی غزلوں میں قدیم شعری روایتوں کی پاسداری کے ساتھ جدت طرازی کی خوشبو بھی محسوس ہوتی ہے۔ رشیدی صاحب فن شاعری کے قواعد وضوابط اور عصری تقاضوں سے کما حقہ واقف اور اس وادی میں عمر کھپائی ہے۔ ابر سفید، الف میم اور آنسو بولتے ہیں کے بعد ان کا یہ چوتھا مجموعہ کلام غزلوں پر مشتمل ہے۔ مجموعہ میں کل ۱۶۳ غزلیں شامل ہیں اور فہرست میں ہر غزل کے پہلے مصرعہ کو اس کا عنوان بنایا ہے۔ فی زمانہ اچھی غزلوں میں بالعموم سادگی، برجستگی، روانی، خیالات کی بلند پروازی، تشبیہات و استعارات کی ندرت، جذبات کی طہارت و پاکیزگی اور جدید موضوعات و مسائل کے عناصر تلاش کیے جاتے ہیں۔ ان خوبیوں سے نہ صرف کلام کا معیار و وزن بڑھتا ہے بلکہ اس کی معنویت و اہمیت اور تاثیر و افادیت میں اضافہ بھی ہوتا

ہے۔اوراق مجموعہ غزل ان خوبیوں کا مرقع ہے۔اس پر صحت زبان نے حسن تغزل کو مزید دوبالا کردیا ہے۔ان کی غزل کا رنگ ان شعروں میں دیکھیں

جیسا نشاط خواب وہ تمام کیف و مستی وہ　　میں پڑھوں تو پڑھتا جاؤں وہ کھلی کتاب جیسا
جو خیال اس کو چھولے تو وہ ایسی روشنی دے　　کوئی ماہتاب جیسا کوئی آفتاب جیسا

رباب رشیدی صاحب نے سخن سنجی اور شعر گوئی کا مشغلہ محض جذبہ شوق کی تسکین کے لیے نہیں اختیار کیا ہے بلکہ وہ اس کو معاشرہ کی اصلاح کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔پہلے اور آج کے تہذیبی و معاشرتی ماحول کی جو عکاسی ایک غزل میں انہوں نے کی ہے اس سے معاشرہ کی نبض پر گہری نظر کے ساتھ ساتھ ان کے اسی مزاج کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ایک غزل کے چند اشعار دیکھیں جن میں طرز ادا کی خوبی کے ساتھ فکر رسا بھی موجود ہے۔

بقدر شوق وطلب کچھ کمی تھی پہلے بھی　　یہی تھے لوگ یہی زندگی تھی پہلے بھی
عجب زمانہ تھا آداب بھی کمال کے تھے　　مزاج عشق میں وارفتگی تھی پہلے بھی
نگاہ اٹھ کے مگر شرم سے نہ جھکتی تھی　　یہاں روایت جامہ دری تھی پہلے بھی
بڑا تفاوتِ معنٰی ہے آج اور کل میں　　کہا یہ جائے گا لیکن خوشی تھی پہلے بھی

رباب رشیدی صاحب کی غزلوں کے موضوعات بھی بالعموم وہی ہیں جو جدید العصر شعرا کے یہاں پائے جاتے ہیں لیکن زبان و بیان پر دسترس اور تعبیرات کی جدت نے اس بزرگ شاعر کو اس فہرست میں نمایاں کردیا ہے۔انہوں نے زندگی کے حقائق سامنے رکھے ہیں۔مسائل سے الجھنے کے بجائے انہوں نے قاری کو عزم و حوصلہ اور امید کے ساتھ آگے بڑھنے اور قیادت کے عام تصور سے باہر نکلنے کا مشورہ دیا ہے۔

دھوپ اگر حوصلہ نہ دے اس کو　　نخل امید پھل نہیں سکتا
اس تصور نے بھی گمراہ کیا ہے ہم کو　　سمت منزل کا پتہ راہ نما ہی جانے

امید ہے کہ رشیدی صاحب کے کلام کا مطالعہ عام ارباب ادب بصد شوق کریں گے (ک ص اصلاحی)

طفلِ برہنہ پا کا عروج: مصنف: پروفیسر جلیس احمد خاں ترین، مترجم: محمود فیض آبادی، فاروس میڈیا (books@pharosmedia.com)، دہلی، ۲۰۲۲، صفحات: ۲۶۵، قیمت: ۳۰۰ روپے

میں نے اپنی زندگی میں لاتعداد کتابوں کا مطالعہ کیا ہے، خصوصاً خود نوشت اور سوانح کا مطالعہ میری

دلچسپی کا مرکز رہے ہیں، ان میں بہت کم ہی کتابیں ایسی رہی ہیں جنہیں پڑھتے ہوئے آنسو رواں ہو گئے ہوں۔ یہ کتاب ان ہی میں سے ایک ہے۔ اس کتاب کو پڑھتے ہوئے مجھے اندازہ ہوا کہ انسان کے اندر اگر جنون اور کچھ کرنے کا جذبہ ہو تو نہ صرف کامیابی اس کا مقدر بنتی ہے بلکہ وہ دوسروں کے لیے بھی رول ماڈل بنتا ہے نیز بدلے میں معاشرے کو بہت کچھ عطا کرتا ہے۔

یہ کتاب ''طفل برہنہ پا کا عروج'' پروفیسر جلیس احمد خان ترین کی ایک ایسی ہی کتاب ہے جو پڑھنے والے کو نہ صرف سوچنے پر مجبور کرتی ہے بلکہ جگہ جگہ پر حیران کر کے رکھ دیتی ہے کہ انسان تن تنہا اپنی کوشش، لگن اور محنت سے کیسے دنیا میں بیش بہا خدمات انجام دے سکتا ہے۔ کتاب کو ملک کے معروف اشاعتی ادارہ ''فاروس میڈیا'' نے دیدہ زیب اور خوبصورت انداز میں شائع کیا ہے۔

تقریباً ۲۶۵ صفحات پر مشتمل یہ کتاب ایک ایسے یتیم بچے کی کہانی ہے جس کے پاس بچپن میں پہننے کے لیے چپل نہیں تھی، سات سال کی عمر میں والد کا سہارا چھن گیا، غربت اتنی زیادہ تھی کہ اسکول میں نیکر پہن کر آنے سے منع کیا گیا تو غریب ماں کے پاس اتنے پیسے نہیں تھے کہ نیا کپڑا اسلوا کے دیتی، پر عزم بیوہ کے پاس اس کے علاوہ کوئی چارہ نہ تھا کہ بڑی بہن کی شلوار پہنا کر بچے کو اسکول بھیج دے۔ وہ جو کر سکتی تھی اس نے وہی کیا، جس پر اسکول کے دیگر بچوں نے ننھے جلیس احمد کا مذاق اڑایا لیکن وہی یتیم بچہ اپنی محنت اور تگ ودو سے کامیابی کے ان مدارج کو طے کرنے میں کامیاب ہوا کہ دیکھنے والے حیران و ششدر رہ گئے۔

اس نے نہ صرف اسکول میں نمایاں نمبروں سے کامیابی حاصل کی بلکہ بعد کی زندگی میں بھی ہر جگہ نمایاں رہا اور یہ پہچان اسے صرف اپنی محنت اور پریشانیوں سے بھرے کام کو بطور چیلنج کے قبول کر لینے کی صورت میں ملی۔ ملک اور بیرون ممالک کے نامور رسائل میں عہد جوانی میں ہی مقالے شائع کرا کر اپنی شناخت بنائی۔ اس کے ان ہی کاموں کا نتیجہ تھا کہ اس نے تین ناکام یونیورسٹیوں کی سربراہی کی اور ان کو بام عروج تک پہنچا کر دم لیا۔ وہ ۲۰۰۱ سے ۲۰۰۴ کے دوران کشمیر یونیورسٹی کا وائس چانسلر رہا، ۲۰۰۷ سے ۲۰۱۳ کے دوران پونڈیچیری یونیورسٹی کی سرپرستی کی تو ۲۰۱۳ سے ۲۰۱۵ کے درمیان بی ایس عبدالرحمن یونیورسٹی چنئی کے وائس چانسلر کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔

آج کل کے ہمارے نوجوان زمانے اور ماحول کا شکوہ کرتے نظر آتے ہیں کہ ان کے ساتھ بھید بھاؤ ہوتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ایسا ہوتا ہے اور اس کو وہی محسوس کر سکتا ہے، جس کے ساتھ ایسے واقعات پیش آئے ہوں، لیکن اس کتاب کے ذریعے ہمیں اس سمت میں بھی رہنمائی ملتی ہے کہ

ایسے منفی رویوں کو کیسے انگیز کیا جائے اور کیسے اپنا راستہ بنایا جائے۔

مصنف نے کتاب میں اپنی ماں کا کافی تفصیل سے ذکر کیا ہے کہ کس طرح انھوں نے غربت و افلاس کے باوجود مصنف اور ان کے بہن بھائیوں کو پالا پوسا اور پڑھایا لکھایا۔ ہمارے معاشرے میں عموماً دیکھا یہ گیا ہے کہ مائیں بچوں کو لاڈ پیار تو دیتی ہیں لیکن تعلیم و تربیت کی طرف توجہ نہیں دیتیں جس کی وجہ سے بچے کی نشو و نما نہ صرف ناقص رہ جاتی ہے بلکہ اس کی شخصیت کا بھی ارتقا نہیں ہو پاتا، حالانکہ مائیں چاہیں تو اپنی اولاد کو ہیرا بنا سکتی ہیں۔ والد کے انتقال کے بعد کئی لوگوں نے یتیم خانہ بھیجنے کی بھی بات کہی لیکن ذمے دار ماموں نے بچوں کو یتیم خانہ بھیجنے سے منع کر دیا۔ یہ بات محل نظر ہے کیوں کہ اکثر ہمارے معاشرے میں باحیات والدین کو بھی دیکھا گیا ہے کہ وہ اپنی ذمے داریوں سے راہ فرار اختیار کرتے ہوئے بچے کو مدرسہ یا ہاسٹل میں ڈال دیتے ہیں اور بے فکر ہو جاتے ہیں۔ انھیں اس بات سے کوئی مطلب نہیں ہوتا کہ بچہ کیا پڑھ رہا ہے اور اس کی کیا ترقی ہو رہی ہے۔ جب گھر کے سرپرست حضرات کو اس سے کوئی مطلب نہیں کہ بچے کی ترقی ہو رہی ہے یا نہیں تو دوسروں کو کیا ضرورت پڑی ہے کہ وہ آپ کے بچے کی فکر کریں۔

کتاب کا بیانیہ انتہائی دلچسپ اور رواں ہے جس سے پڑھنے والا بور نہیں ہوتا ہے بلکہ مزید دلچسپی سے پڑھتا جاتا ہے اور کتاب ختم کرنے کے بعد بھی ایک ناول یا افسانے کی طرح حسرت رہتی ہے کہ کتاب کو ابھی ختم نہیں ہونا تھا۔ دراصل مشکل سے مشکل بات کو بھی خوبصورت انداز میں کہنے کا سلیقہ مصنف نے ایسا اختیار کیا ہے کہ قاری اس میں محو ہو کر رہ جاتا ہے۔ حالانکہ اصل کتاب انگریزی زبان میں لکھی گئی ہے لیکن محمود فیض آبادی نے قابل تعریف ترجمہ کیا ہے، اس کے بعد ڈاکٹر ظفر الاسلام خان، گلزار صحرائی، اور اجمل فاروق جیسے صاحب نظر اور زبان و اسلوب کے رمز شناسوں نے اس پر نظر ثانی کا کام کر کے کتاب میں چار چاند لگا دئے ہیں۔ یہی وجہ ہے ترجمہ پر بھی اصل کا گماں ہوتا ہے بلکہ سچی بات تو ہے کہ اگر کتاب میں مترجم یا نظر ثانی کرنے والوں کا نام نہیں دیا جاتا تو پڑھتے ہوئے اس بات کا احساس بھی نہیں ہوتا کہ قاری ترجمہ پڑھ رہا ہے۔

کتاب میں کل گیارہ ابواب ہیں، لیکن یہ زیادہ طویل نہیں بلکہ چھوٹے چھوٹے مضامین کی شکل میں ہیں جس سے قاری پر کتاب کا مطالعہ گراں نہیں گزرتا ہے۔ کتاب کا پیش لفظ معروف صحافی سدھیر کلکرنی نے لکھا ہے جو خاصی اہم چیز ہے۔ سدھیر کلکرنی نے تفصیل سے کتاب کا تعارف کرا دیا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ چند صفحات میں انہوں نے کتاب کی تلخیص کر دی

ہے جس کے مطالعے سے قاری کو اندازہ ہو جاتا ہے کہ کتاب کا مطالعہ کرنا چاہئے یا نہیں۔ اپنے اس مقدمہ میں انھوں نے دریا کو کوزے میں بند کر دیا ہے۔ انداز بھی فاضلانہ ہے، جس سے حالات کو سمجھنے میں کافی مدد ملتی ہے۔

کتاب کی ایک چیز جو مجھے بہت اچھی لگی وہ یہ کہ مصنف نے کئی ابواب کے شروع اور کہیں کہیں پر درمیان میں مغربی مصنفین و مفکرین کے اقوال کا خوبصورت استعمال کیا ہے۔ اس سے نہ صرف کتاب کی معنویت میں اضافہ ہوا ہے بلکہ کتاب کا حسن بھی دوبالا ہوتا نظر آتا ہے۔ اس سے اس بات کا اندازہ بھی ہوتا ہے کہ مصنف کے اندر ایک خوبصورت آرٹسٹ چھپا ہوا ہے جو اس بات سے اچھی طرح واقف ہے کہ خوبصورت چیز کیسے تلاش کی جائے اور اس کو اپنی تخلیقی صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر کیسے لاجواب بنایا جائے۔ کتاب پڑھتے ہوئے اس کا اندازہ جگہ جگہ ہوتا ہے کہ مصنف ایک فن کار ہے اور اسے بات کہنے کا سلیقہ خوب آتا ہے۔

اس کتاب کے ذریعے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ مصنف نہ صرف ایک مشہور سائنس داں، ماہر تعلیم اور اعلیٰ منتظم اور قائد ہیں بلکہ اس بات کا پتہ بھی چلتا ہے کہ وہ ایک آرٹسٹ بھی ہیں جس کی دلیل ان کے ہاتھوں سے بنا ہوا کتاب کا سرورق ہے۔ اس کے علاوہ بھی انہوں نے کئی ایسے آرٹ کے نمونے بنائے جن کی فروخت لاکھوں میں ہوئی اور اس کا ایک وافر حصہ انہوں نے مسلم بچوں کی تعلیم کے لیے عطیہ کر دیا۔ وہ ایک اچھے شاعر بھی ہیں اور اس کا ثبوت انہوں نے پونڈی چیری یونیورسٹی کا ترانہ لکھ کر دیا جس کا تذکرہ انہوں نے اس کتاب میں کیا ہے۔

اگر مختصراً اس کتاب کے بارے میں مجھے کچھ کہنا ہو تو میں یہی کہوں گا کہ خصوصی طور پر ہر مسلم قائد کو اس کتاب کا مطالعہ کرنا چاہئے اور اپنا جائزہ بھی لینا چاہئے کہ کیا وہ واقعی قائد کہلانے کے مستحق ہیں جو اپنے ایر کنڈیشنڈ کمروں میں بیٹھ کر ملت کے عروج کا خواب دیکھتے ہیں۔ صحیح معنوں میں پروفیسر جلیس احمد خاں ترین جیسے لوگ قائد کہلانے کے مستحق ہیں اور ملت کے باشعور افراد کو چاہئے کہ ایسے افراد کو تلاش کر کے ان کی عزت افزائی کریں اور ان سے سبق سیکھیں تاکہ آنے والی نسلیں ان کے نقش قدم پر چلتے ہوئے ملت کی ڈوبتی ناؤ کو کھے سکیں (محمد علم اللہ)۔

ادبیات

نعت

محمد حیات عامر حسینی

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی۔ علی گڑھ

وہ جانِ جہاں ہے وہ رشکِ جمال | اسی کا نشاں ہیں یہ بدر و ہلال
اسی کا بیاں ہے یہ رقص ظہور | یہ اوجِ ثریا یہ نقشِ کمال
اسی کا زماں ہے وجود طرب | اسی کا بیاں ہے یہ ماضی یہ حال
سبھی معرکوں کا شہید ازل | سبھی مرحلے ہیں اسی کا خیال
وہ ختم الرسل ہے وہ نقشِ ازل | وہ ساز رواں ہے دمِ لازوال
ازل سے ابد تک اسی پر درود | اسی کی ثنا ہے، ثنائے جلال
تصور اسی کا دمِ زندگی | رفیق رفیقاں نصیب وصال
یہ زلفیں گھٹائیں یہ موجِ نفس | یہ رقص وُدود و شہہ خوش خصال
سبھی آیتوں میں وہ موجِ رواں | سبھی آیتوں کا اسی سے کمال
وہ یٰسین و فرقاں و طٰہٰ ہے | وہ ساقی وہ رم جھم وہی بے مثال

حسینی کو اذن مدینہ ملے
تمنا یہی ہے یہی ہے سوال

غزل

زاہد جعفری

جعفری باغ، جلالپور، فیض آباد۔ یو.پی ۲۲۴۱۴۹ موبائل: ۹۴۵۲۶۵۲۴۸۸

میں تھا چپ! کیوں تِرے لشکر کی زباں بیٹھ گئی؟ | دہشت خوں، بہ دلِ دشمنِ جاں بیٹھ گئی
کتنی بے چین تھی بے چاری تڑپ کر آخر | آکے خرمن میں مرے برقِ تپاں بیٹھ گئی
اب کہاں دھوپ سے بچنے کو بھلا جائے غریب؟ | اِتنی بارش تھی کہ دیوارِ مکاں بیٹھ گئی
زندگی بول! بھلا اُنگلی پکڑ کر میری | یہ کہاں سے مجھے لے آئی؟ کہاں بیٹھ گئی؟

دشت میں کیا نگہِ قیس غزل ڈھونڈھتی ہے محملِ لب میں تو لیلائے بیاں بیٹھ گئی
ٹوٹ ہی جاتے ہیں رقّاصۂ زر کے گھنگرو یہ ہے بازار! یہاں کتنی دُکاں بیٹھ گئی
دیکھ کر صحن میں بٹوارے کی پاگل تقسیم ٹیک کے پیٹھ کو دیوار سے ماں بیٹھ گئی
دَھار خنجر کی ہے یا سانس ہے یا قطرۂ خوں کون سی چیز یہ نزدِ رگِ جاں بیٹھ گئی
صورتِ تاج محل جمنا کے تٹ پر زاہد
آرزوئے نگہِ شاہ جہاں بیٹھ گئی!

غزل

خالدندیم

صدر شعبۂ اُردو اور مشرقی زبانیں، سرگودھا یونیورسٹی سرگودھا (پاکستان)

dr.khalidnadeem@gmail.com

اس منزلِ حیات پہ جذبات منتشر اعمال منتشر ہیں، مناجات منتشر
گل چیں کی اک ہوس کے نتیجے میں باغ کی ہر شاخ گل بریدہ ہے اور پات منتشر
اک وقت تھا کہ تجھ پہ توجہ تھی مرتکز اک وقت ہے کہ سارے خیالات منتشر
شاید تجھے کسی کی تمنا ہے آج بھی پھرتا ہے ورنہ کون یوں دن رات منتشر
ترتیب دے سکا نہ کبھی دھن تری ندیم تو منتشر ہے اور ترے نغمات منتشر

معارف کی ڈاک

مولانا حفیظ الرحمان اعظمی عمری مرحوم

معارف (جولائی ۲۰۲۲) میں وفیات کے کالم میں مولانا حفیظ الرحمان اعظمی عمری مرحوم کے حوالے سے مذکور ہے: ''مدراس میں اعظمی کی نسبت سے شبہ ہوا کہ اس وادی سے ان کا [مولانا حفیظ الرحمان اعظمی عمری مرحوم] گزرا ابھی ماضی قریب کی بات ہے لیکن معلوم ہوا کہ یہ نسبت محض اضافی ہے۔ان کے والد شیخ الحدیث محمد نعمان، میاں نذیر حسین محدث دہلوی کے شاگرد تھے۔ وہ ۱۹۲۸ میں عمر آباد کی جانب ہجرت کر گئے اور پھر تاعمر وہیں آباد رہے یعنی قریب ایک صدی سے یہ خاندان اعظمی وہیں کا ہو کر رہ گیا'' (ص: ۵۵۰)۔

اطلاعاً عرض ہے کہ مولانا مرحوم کا تعلق محلہ ڈومن پورہ، مئو ناتھ بھنجن سے تھا۔ ان کے والد نے اسی شہر سے ہجرت کر کے عمر آباد کو اپنا مسکن بنایا تھا اور اسی مناسبت سے مولانا مرحوم کا خاندان 'اعظمی' لکھتا ہے اور دیار شبلی سے انتساب پر شاداں ہے اور نازاں بھی۔ عمر آباد ہجرت کرنے سے قبل ان کے والد جامعہ عالیہ عربیہ (مئو ناتھ بھنجن) سے منسلک تھے اور اس سے ملحق مدرسۃ البنات کے قیام میں ان کا کردار کلیدی تھا۔ انھی کی دعوت اور درخواست پر علامہ سید سلیمان ندوی نے مدرسۃ البنات کا دورہ کیا تھا اور نقل معائنہ میں شہر میں تعلیم نسواں کے آغاز میں علما اور عوام کی کوششوں کو سراہا بھی تھا۔ علامہ ندوی کے تاثرات، روداد مدرسہ عالیہ عربیہ، مئو ناتھ بھنجن ۱۹۱۹ اور صد سالہ تقریب مدرسہ عالیہ عربیہ مئو ۱۹۶۸ (مرتب: عبدالقیوم اعظمی) میں ملاحظہ کیے جا سکتے ہیں۔

مولانا حفیظ الرحمان عمری مرحوم نے اپنے بھانجے ڈاکٹر مقتدی حسن ازہری پر اپنے مضمون ڈاکٹر ازہری کا خاندانی پس منظر اور تعلیم و تعلم کی راہ میں ان کا سفر (سہ ماہی افکار عالیہ، ڈاکٹر مقتدی حسن ازہری نمبر، (اپریل ۲۰۱۲ تا جون ۲۰۱۳)، مرتب: مولانا حافظ عبداللطیف اثری، جامعہ عالیہ عربیہ مئو ناتھ بھنجن) میں بھی اپنے خاندانی حالات کی طرف اشارہ کیا ہے۔ مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ فرمائیں: محمد ثناء اللہ عمری (مرتب)، بات ایک مسیحا نفس کی، ادارہ تحقیقات اسلامی، عمر آباد ۱۹۹۹)، محمد رفیع کلوری، پیکر علم و عمل: مولانا محمد نعمان اعظمی، ادارہ تحقیقات اسلامی جامعہ دارالسلام، عمر آباد، ۲۰۱۴۔

اطہر افضال، نئی دہلی
atharafzal@gmail.com

مغازی وسیرت نگاری

علامہ شبلی نعمانی نے سیرت النبی کی جلد اول میں ماضی کے قدیم سیرت نگاروں کی ایک فہرست دی ہے جس میں پہلا نام خلیفۂ اول کے نواسے عروہ ابن زبیر (۹۴ہجری) اور آخری نام ابو بکر احمد خیثمہ البغدادی (۲۹۹ہجری) کا لکھا ہے۔ ان سب میں بھی اختلاف موجود ہے۔ محمد بن اسحاق یسار البغدادی (۸۵تا۱۵۱ہجری) کی کتاب المغازی ہے۔ اس کا عنوان ہی بتارہا ہے کہ یہ محض سیرت نہیں ہے اور پھر تاریخ کے کئی گوشے سیرت نگاری، سوانح، بیانِ واقعات، شاہنامہ، تزک مغازی ہیں۔ کس کی توجہ کس رُخ پر ہے یہ بھی دیکھنا ہوگا۔ وہ صحابی نہیں بلکہ تابعی ہیں۔ انھوں نے صرف ایک صحابی حضرت انس کو دیکھا تھا۔ وہ امام زہری کے خاص مرکز نگاہ تھے۔ اسی لیے وہ ابن اسحاق کے بارے میں کہتے تھے: ہذا اعلم الناس (یہ لوگوں میں سب سے زیادہ علم والا ہے)۔ امام احمد بن حنبل کہتے تھے: یہ حسن الحدیث ضرور ہے مگر حرام و حلال میں حجت نہیں ہے۔ انھوں نے کوفہ، بصرہ، اسکندریہ اور بغداد کا سفر کیا اور بغداد میں ان کا انتقال ہوگیا۔ دوسری صدی ہجری میں ابن اسحاق نے علمی انداز میں مغازی کو پیش کیا۔ اس فن میں ان کو اولیت حاصل ہے اگرچہ وہ سیرت نگاری کے بانی نہیں ہیں۔ امام نسائی، امام مالک، محدث دار قطنی، امام مکّی یحیٰ بن قطان وغیرہ نے بھی ان پر بروقت جرح و تنقید کی ہے۔

اپنے مکتوب میں ڈاکٹر راہی فدائی نے ابن اسحاق کی شخصیت کو متضاد اور متنازع بتایا ہے۔ یہ تنقیدی انداز، جذبۂ تنقیص کی غمازی کرتا ہے۔ ویسے تنقید اگر تعمیری اور استفہام کے لیے ہو تو ٹھیک ہے ورنہ تخریبی نکتہ چینی ہو مستحسن نہیں ہے۔ ڈاکٹر صاحب موقر صاحب قلم ہیں۔ اسی شمارے میں ان کا مضمون زبور و انجیل فارسی تراجم کے عنوان سے دماغ کو چونکا دینے والا ہے۔ مگر یہ قاضی نظام الدین مغیر نائیطی کے خاندان کا شجرہ ہو کے رہ گیا ہے (معارف جولائی ۲۰۲۲ء صفحہ ۵۱۳تا۵۲۳)، البتہ آخری تین صفحات بہت اہم اور تحقیقی ہیں، لائق اعتراف و مبارکباد ہیں۔ اس تلاش و جستجو کی تعریف نہ کرنا ناانصافی ہوگی مگر سرور الصدور المعروف الزبور اور فیض الجلیل فی ترجمۃ الانجیل کے نمونوں کے اندرجات نہ ہونے سے یہ مضمون تشنہ لگتا ہے۔

معارف جولائی ۲۰۲۲ء میں ڈاکٹر راہی فدائی کے خط سے صرفِ نظر نہیں کیا جاسکتا۔ انہوں نے جاوید ملک (مئی ۲۰۲۲ء) کے مضمون پر انگلی اٹھائی ہے اور محمد بن اسحاق کی روایت کردہ تحریر پر انگلی رکھی ہے۔ انہوں نے پوچھا ہے کہ محمد بن اسحاق کی روایت کو لینا کہاں تک معقول و مدلل ہے۔ ان کا

دوسرا پیرایہ ہے کہ تاریخ اسلام کے مشتملات پر از سرِ نوا گر تحقیق کرائی جائے تو کیا اس سے نئے باب کھلیں گے یا معاملہ بر عکس ہو گا۔ جس کو علمی تبحر ہو وہ اس بحرِ بیکراں میں کود ے اور نیا موتی نکال کے دکھائے اور شیعہ سنّی دونوں مکتبۂ فکر کو مطمئن کرے۔ اس کا جواب ڈاکٹر ظفر الاسلام خان نے نہایت سنجیدہ اور متانت آمیز لکھا ہے اور درست فرمایا ہے کہ تحقیق تا یوم قیامت جاری رہے گی مگر ایسے حل کا نکالنا جو سب کے لیے قابلِ قبول ہو اس کا کوئی امکان نہیں۔

عہدِ بنی امیہ و بنی عباس کی ۵۲۴ سالہ مدت حکومت گزر چکی۔ کربلا کے المیے پر دونوں کی شدت پسندی و نفرتِ آل پیغمبر اور شیعیان علی مرتضیٰ کی مخاصمت کے نقوش خونچکاں ہیں۔ ایسی حالت میں ڈاکٹر ظفر الاسلام خان کا مشورہ اس قدر صائب ہے اور مستحکم ہے کہ اس کے علاوہ دوسرا کوئی راستہ نہیں ہے کہ ذمہ دار مؤرخین تمام مخاصمتی مواد سے صرفِ نظر کرتے ہوئے بہتر سے بہتر حقائق کی تدوین کریں جس سے امتِ اسلامیہ جُڑ سکے (معارف جولائی ۲۰۲۲ء)۔

ڈاکٹر راہی فدائی نے تیسرے سوال میں جنگ صفّین (۳۰ ہجری) اور جنگ جمل (۳۶ ہجری) کا جو حوالہ دیا ہے وہ تاریخ اسلامی کا بہت تلخ موضوع ہے۔ تین بڑی ہستیوں کے اقداماتِ دانستہ کو خطائے اجتہادی کہہ کر سکوت اختیار کر لینا سوالوں کا حل نہیں۔ الحق مرّ۔ یہ معاملہ صرف عقیدت اور ارادتمندی کا نہیں ہے۔ یہ ہیرو پسندی ہے جس میں اندازِ رندانہ کا فقدان ہے۔ جو گروہ حضرت عمار یاسر، حضرت اویس قرنی اور حضرت حذیفہ بن ثابت انصاری کو قتل کرے اس کے بارے میں کہا جائے گا؟ کیا اس کو اقدام خودکشی کہہ دیں؟ جس کی ماں سید الشہداء کا جگر چبائے، جس کو رسول اکرم شہر بدر کریں، جس کا بھائی، بہن کے خلاف تلوار اٹھائے، اس کے بارے میں کیا کہا جائے گا؟ کشمکش تو یہ ہے کہ صحابۂ کرام رہنمائے نسلِ انسانی ہیں۔ ان کے بارے میں سوء ظن رکھنا بد گمانی اور وسواس شیطانی ہے۔ صحابۂ ذوی الاحترام و تابعین عظام جن کے ساتھ ہوں وہ خطائے اجتہادی کیسے کر سکتا ہے؟ جس کے ساتھ کتاب اللہ اور اہل بیت رسول ہوں وہ دین پر دنیا کو ترجیح دے کیسے سکتا ہے؟ جن کو رسول کہہ دیں: اللھم اِنّ ھٰولآءِ اھل بیتی وحاجتی . . . . . انھم منی وانامنھم . . . .
اور آخری خطبہ (حجۃالوداع): وانّاتارک فیکم الثقلین اولھما کتاب اللہ فیہ الھدی والنور فخذوا کتاب اللہ وتمسکوا بہ واھل بیتی اذکرکم اللہ فی اھل بیتی . . . . مَن کنتُ مولاہ فعلی مولاہُ، والِ من ولاہُ وعادِ من عاداہُ (سیرت النبی جلد دوم صفحہ ۱۱۶،۱۳۰ و المائدہ آیت نمبر ۳) کے نازل ہونے کے بعد کسی اور سند کی ضرورت کہاں رہ جاتی ہے؟

ڈاکٹر راہی فدائی نے آخر میں تین آیتوں کا حوالہ دیا ہے۔ حالاں کہ ان کا پس منظر موصوف نے نہیں دیکھا: (۱) ومن یقتل مومناً متعمداً فجزاؤہ جہنم خالداً فیھا وغضب اللہ علیہ ولعنہ واعدّلہ عذاباً عظیماً (سورۂ النساء آیت نمبر ۹۳) (۲) رضی اللہ عنہم ورضوا عنہ (مجادلہ آیت نمبر ۲۲) (۳) اور (سورۂ مائدہ آیت نمبر ۱۱۹)۔ آخری دو آیتیں دو واقعوں کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔ ان میں جھوٹی قسمیں کھانے والوں اور کانا پھوسی کرنے والوں سے کہا جارہا ہے کہ ایسے کے لیے عذاب یہیں ہے، ان پر شیطان کا قبضہ ہے، وہ ذلیل ہیں۔ مگر وہ جنھوں نے آباؤھم وابناؤھم واخوانھم وعشیرتھم کی پرواہ نہ کرتے ہوئے یؤمنون باللہ والیوم الآخر کہہ دیا، ان کے لیے بروحٍ منہ اور رضی اللہ عنھم ہے۔ اور سورۂ مائدہ کی آیت کا تسلسل ۱۰۹ سے ۱۱۹ تک براہِ راست حضرت عیسیٰ ابن مریم سے گفتگو ہے۔ جب خدا گہوارے سے انجیل و توریت کے سبق و معجزۂ طیر و عطائے بینائی و حیاتِ مُردہ و نزول مائدہ اور وعدۂ عید تک فہرست گن گن کر بتالیتا ہے تو مخالفین و منکرین کو حزب الشّیطان، منافق، حادّ اللہ ورسولہٗ کہتا ہے اور اقرار عیسیٰ پر رضی اللہ عنہم ورضوا عنہ، اور وھو اللہ علی شیءٍ قدیر کہتا ہے۔

ڈاکٹر ظفر الاسلام کا یہ فیصلہ کہ مخاصمتی لٹریچر سے صرفِ نظر کو اگر فوقیت دی جائے تو عام افادہ کی صورت نکل سکتی ہے۔ الجھ کر زبان و بیاں کو آلودۂ عصیاں کرنا دانشمندی نہیں۔ سچّی بات تو یہ ہے کہ جو کچھ قرآن حکیم کہے اور جو کچھ ارشاد رسولِ صادق ہو بس وہی حق ہے، باقی کی کوئی حیثیت نہیں۔ اَلْعَاقِلُ تکْفِیہ الاشارۃ۔

زاہد جعفری، جعفری باغ، جلال پور
۹۴۵۲۶۵۲۴۸۸

وفیات

آہ! مولانا جلال الدین عمری مرحوم

مولانا جلال الدین عمری کے سانحہ ارتحال کی خبر سے رجال کار کی کمی کا درد اور سوا ہو گیا۔ امت کی آزمائشوں کے اس دور میں مولانا جیسی مخلص شخصیت کا وجود بہت غنیمت تھا۔ مولانا ۲۶ اگست کو اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔ مولانا ۱۹۳۵ء میں پیدا ہوئے یعنی قریب ستاسی اٹھاسی کی مدت اس دنیا کے لیے ودیعت ہوئی اور حق یہ ہے کہ انہوں نے اس امانت کا حق ادا کر دیا۔

وہ جامعہ دارالسلام عمرآباد کے فارغ التحصیل تھے۔ مسلم یونیورسٹی سے انگریزی میں گریجویشن کیا۔ اس سے پہلے مدراس یونیورسٹی سے فارسی زبان میں منشی فاضل بھی ہوئے۔ گویا قدیم وجدید کے جامع ایسے صاحب علم تھے جس کی ضرورت ملت اسلامیہ ہند کو تھی۔ انہوں نے اسی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے جماعت اسلامی کے طرز فکر اور طریق عمل کو زیادہ پسند کیا۔ جماعت سے وابستگی ہوئی تو امیر جماعت کے منصب تک پہنچے۔ مختلف تعلیمی اداروں کی سرپرستی بھی کی جن میں جامعۃ الفلاح بلریا گنج خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ عملی لحاظ سے جماعت و جامعہ کی دیکھ بھال کم نہیں لیکن اصل میدان عمل ان کا اسلام کی اشاعت کا تھا۔ زمانہ کے تقاضوں کو سمجھ کر نہایت پر حکمت اسلوب میں فکر و قلم کی سلامت و حرمت کا خیال رکھتے ہوئے انہوں نے گویا اپنی زندگی نئے علم کلام کے لیے وقف کر دی۔ نتیجہ برکت کی شکل میں ظاہر ہوا۔ کہا جاتا ہے کہ پچاس سے زیادہ کتابیں تیار کیں۔ قرآن مجید، حدیث شریف، سیرت مبارکہ، فقہی مباحث، انسانی اور معاشرتی اقدار پر ان کا قلم بے تکان سرگرم سفر رہا۔ اسلامی تعلیمات کی روشنی میں وہ ان علوم کی نئی نئی منزلیں تلاش کرتے اور کامیاب ہوتے رہے۔ ان کی ان تالیفات و تصنیفات کو قبولیت بھی خوب ملی اور خدا جانے کتنوں نے ان کی کتابوں کی مدد سے اپنے اپنے حلقوں میں اسلام کی ترجمانی کا فریضہ انجام دیا۔ موضوعات کے انتخاب میں اور پھر ان کے ساتھ انصاف کرنے میں مولانا کی انفرادیت کا ذکر ہوتا رہے گا اور یہ ان کی مقبولیت ہی نہیں ان کے لیے گویا صدقہ جاریہ کا جواز بھی ہوگا۔ تصانیف کی کثرت اور ساتھ ہی موضوعات و مباحث کے تنوع کی خوبی، جماعت اسلامی کی روایات کی توسیع کہی جاسکتی ہے۔ کار منصبی کے طور پر اس تسلسل سے قلم و کاغذ کا رشتہ استوار رکھنا آسان کام نہیں۔ یہ فرض انہوں نے جس تواتر سے ادا کیا وہ اپنی ذمہ داری کی اہمیت سمجھنے کا قابل تقلید اور حد درجہ لائق تحسین نمونہ ہے۔ مولانا کی یہ بات بھی ہمیشہ پیش نظر رہنے اور رکھنے کے لائق ہے کہ قلم کے آہنگ کو اعتدال ہی میں رکھا جانا

چاہیے۔ مضامین کو پیش کرتے وقت ان کا یہ کہنا کہ ان کی نوعیت ایک طالب علم کے قلم سے اظہار خیال کی ہے۔ یہ کسی اور فرد یا ادارے کی ترجمانی نہیں، ذاتی رائے کے اظہار کی بڑی سادہ لیکن سچی مثال ہے۔ان کی ایک مختصر سی کتاب میں یہ جملہ ان کے مطالعہ و تجزیہ کی روح کا ترجمان ہے کہ بحث و نظریہ کا یہ طریقہ زیادہ کارآمد ہے کہ انسان کی حقیقت سے اس کے مسائل کی روشنی میں بحث کی جائے، ورنہ فلسفیانہ خالص علمی گفتگو کے لیے مخاطب بھی وہی ہوں جن کا معیار علم و تحقیق بلند ہو۔ تحریر کی سادگی اور سلاست اور مخاطب کی عقل و فہم کے لحاظ سے بات کہنے کی فن کاری، مولانا کی ہر تحریر کا نمایاں حصہ ہے۔

ایک بڑی تنظیم کی امارت بہت کچھ کی طالب ہوتی ہے لیکن مولانا کے خلوص اور جذبوں کی سچائی تھی کہ مولانا ابواللیثؒ اصلاحی کی طرح ان کے دور نے جماعت کی نیک نامی میں اضافہ ہی کیا۔ وہ اس سچائی سے واقف تھے اور اس کے اظہار میں ان کو ہچکچاہٹ نہیں تھی کہ موجودہ زمانے میں مسلمانوں میں تقویٰ اور خدا ترسی کی کیفیت پہلے جیسی نہیں رہی۔ اخلاقی امتیاز بھی باقی نہیں۔ ایسے میں بعض قدیم فقہی رایوں پر نظر ثانی کا تقاضا بے جا نہیں۔ یہ جرأت اظہار یوں ہی نہیں آتی۔ اس کا سرچشمہ ذہن کے ساتھ دل کی پاکیزگی ہے۔ اس کا پیمانہ یوں تو تلاش کرنا مشکل ہے لیکن مولانا نے جب پہلی بار عمرہ کے لیے اللہ کے گھر کا رخ کیا اور پیروں کو باب السلام کی چوکھٹ مس کرنے کی سعادت ملی تو دل کی کیفیت یہ تھی کہ ''جی چاہ رہا تھا کہ دوڑ کر چمٹ جاؤں۔ اپنے ہاتھ دیکھے دونوں ہاتھ خالی تھے، کوئی سوغات نہ تھی لیکن یہ جانتا تھا کہ جس دربار میں جا رہا ہوں وہ غنی اور بے نیاز ہے، اسے کسی چیز کی حاجت نہیں، وہ بڑا داتا ہے، وہ کسی کو خالی ہاتھ لوٹاتے ہوئے شرماتا ہے''۔

مولانا تامل ناڈو کے ایک گمنام قصبے کی مٹی سے اٹھے اور پھر زندگی کی راہوں پر وہ منزل کی تلاش میں پھر پچاسوں سال اپنے قصبے نہ لوٹ سکے۔ دلی کی خاک نے ان کو اپنی آغوش میں چھپالیا۔ کتابوں کی تصنیف، رسالوں کی ادارت، نئے لکھنے والوں کی آباد کاری، فکری توسع، نظریاتی رواداری، اسلام کے پیام انسانیت کو عام کرنے کی ذمہ داری اور امت مسلمہ کی یکجہتی کی طلب اور تڑپ، یہ سب ان کی کتاب زندگی کے عنوان ہیں جو ان کے بعد والوں کی توجہ کے لائق ہیں۔ دارالمصنفین سے بھی ان کا تعلق علمی و قلبی رہا۔ سو سالہ جشن کی رونق میں ان کی موجودگی سے بڑا اضافہ ہوا۔ خاموشی، دلسوزی، منکسر مزاجی کی وہ تصویر نظر آئے۔ اللہ تعالیٰ حسنات کو شرف قبول عطا فرمائے، ان میں شامل کرے جن کا استقبال روز آخرت سلام علیکم بما صبرتم کے ترانے سے کیا جائے گا۔ (ع۔ص۔)

رسید کتب موصولہ

اسلام اینڈ اکنامکس۔ شاہ ولی اللہ اپروچ: ڈاکٹر عبد العظیم اصلاحی، دی اسلامک فاؤنڈیشن، لیسٹر، برطانیہ، صفحات ۲۴۲، سال اشاعت ۲۰۲۲ء، قیمت درج نہیں۔

تذکرہ محدثین جنوب اور دیگر مضامین: ڈاکٹر راہی فدائی، الانصار پبلی کیشنز، ریاست نگر، حیدرآباد (تلنگانہ)، صفحات ۳۴۴۔ سال اشاعت ۲۰۲۰ء، قیمت ۵۰۰ روپے۔

خلافت وملوکیت اور حضرت عمر بن عبد العزیزؒ: مولانا سید شاہ آیت اللہ قادری، خانقاہ مجیبیہ پھلواری شریف، پٹنہ، صفحات ۴۲۴، سال اشاعت ۲۰۲۱ء، قیمت ۴۰۰ روپے۔

خیر الماعون فی منع الفرار من الطاعون: مولانا عبد الرحمن مبارکپوری، تخریج: مولانا راشد حسن مبارکپوری، ص۔ب ۶۷۵۹/۱۴ بیروت، لبنان، E-mail:info@almoqtabas.com، صفحات ۲۸۴، سال اشاعت ۲۰۲۱ء قیمت درج نہیں۔

شبلی اقتباسات کی روشنی میں: ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، دار المصنفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ۔ صفحات ۱۶۰۔ سال اشاعت ۲۰۲۲ء، قیمت ۲۵۰ روپے۔

عجائب القرآن: مولانا سید جاوید احمد ندوی، ندوی بک ڈپو ندوۃ العلماء، لکھنؤ۔ صفحات ۵۶۰۔ سال اشاعت ۲۰۲۲ء، قیمت درج نہیں۔

علامہ شبلی اور انجمن ترقی اردو: ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، مغربی بنگال اردو اکاڈمی، صفحات ۲۳۲۔ سال اشاعت ۲۰۲۱ء، قیمت ۱۴۰ روپے۔

قرآنی علوم کا ارتقاء عہد اسلامی کے ہندوستان میں: ڈاکٹر ظفر الاسلام اصلاحی، براؤن بکس اپوزٹ بلائنڈ اسکول، قلعہ روڈ، شمشاد مارکیٹ، علی گڑھ۔ صفحات ۲۳۲، سال اشاعت ۲۰۲۲ء، قیمت: ۲۵۰ روپے۔

کنز المعانی: (ملفوظات مخدوم جہاں شیخ شرف الدین یحیٰ منیری) جامع جناب زین بدر عربی خانقاہِ منعمیّہ، میتن گھاٹ، پٹنہ سیٹی (بہار)۔ صفحات ۵۵۲۔ سال اشاعت ۲۰۲۰ء، قیمت ۵۰۰ روپے۔

معالجاتی مشاہدات: حکیم مصباح الدین اظہر، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، علی گڑھ۔ صفحات ۱۵۹۔ سال اشاعت ۲۰۲۲ء، قیمت: ۴۰۰ روپے۔

تصانیف علامہ شبلی نعمانیؒ

سیرۃ النبیؐ جلد اول و دوم (یادگار ایڈیشن)	2000/-	موازنہ انیس و دبیر	250/-
سیرۃ النبیؐ (خاص ایڈیشن مکمل سیٹ ۷ جلدیں)	2800/-	اورنگ زیب عالمگیر پر ایک نظر	100/-
مقدمہ سیرۃ النبیؐ	30/-	سفر نامہ روم و مصر و شام	200/-
الفاروق	350/-	کلیات شبلی (اردو)	220/-
الغزالی	300/-	کلیات فارسی (فارسی)	--
المامون	175/-	مقالات شبلی اول (مذہبی)	170/-
سیرۃ النعمان	300/-	مقالات شبلی دوم (ادبی)	70/-
سوانح مولانا روم	220/-	مقالات شبلی سوم (تعلیمی)	170/-
شعر العجم (اول)	250/-	مقالات شبلی چہارم (تنقیدی)	200/-
شعر العجم (دوم)	150/-	مقالات شبلی پنجم (سوانحی)	150/-
شعر العجم (سوم)	125/-	مقالات شبلی ششم (تاریخی)	150/-
شعر العجم (چہارم)	200/-	مقالات شبلی ہفتم (فلسفیانہ)	100/-
شعر العجم (پنجم)	150/-	مقالات شبلی ہشتم (قومی و اخباری)	150/-
مکاتیب شبلی (اول)	150/-	الندوہ (۹ جلدیں)	4735/-
مکاتیب شبلی (دوم)	190/-	اسلام اور مستشرقین (چہارم)	250/-
الانتقاد علی تاریخ التمدن الاسلامی (محقق ایڈیشن) تحقیق: ڈاکٹر محمد اجمل ایوب اصلاحی	350/-	الکلام	250/-
		علم الکلام	200/-
خطبات شبلی	150/-	انتخابات شبلی (سید سلیمان ندوی)	200/-

ISSN 0974-7346 Ma'arif (Urdu) Print OCT 2022 Vol. 209/10

RNI No. 13667/57 MA'ARIF AZM/NP-43/022

Monthly Journal of

DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY

P.O. Box No: 19, Shibli Road, Azamgarh, 276001 U.P., India

Tel. 06386324437 Email: info@shibliacademy.org

دارالمصنّفین کی چند اہم مطبوعات

سیرت عمر بن عبدالعزیز	مولانا عبدالسلام ندویؒ	100/-
مولانا الطاف حسین حالی کی یاد میں	پروفیسر اشتیاق احمد ظلی	250/-
مطالعات شبلی	،،،،	550/-
حیات سعدی	خواجہ الطاف حسین حالی	400/-
شبلی شناسی کے اولین نقوش	پروفیسر ظفر احمد صدیقی	600/-
شبلی کی آپ بیتی	مرتبہ: ڈاکٹر خالد ندیم	325/-
امام رازی	مولانا عبدالسلام ندویؒ	320/-
حیات سلیمان	شاہ معین الدین احمد ندویؒ	600/-
تذکرۃ المحدثین (اول)	مولانا ضیاء الدین اصلاحیؒ	200/-
تذکرۃ المحدثین (دوم)	،،،،	225/-
تذکرۃ المحدثین (سوم)	،،،،	300/-
محمد علی کی یاد میں	سید صباح الدین عبدالرحمنؒ	120/-
مولانا ابوالکلام آزاد	مولانا ضیاء الدین اصلاحیؒ	240/-
ابن رشد	محمد یونس فرنگی محلیؒ	330/-
تاریخ اسلام (اول و دوم مجلد)	شاہ معین الدین احمد ندویؒ	375/-
تاریخ اسلام (سوم و چہارم مجلد)	،،،،	500/-
تاریخ صقلیہ اول	سید ریاست علی ندویؒ	400/-
تاریخ صقلیہ دوم	،،،،	400/-
اسلام میں مذہبی رواداری	سید صباح الدین عبدالرحمن	250/-
یہود اور قرآن	مولانا ضیاء الدین اصلاحیؒ	150/-
تاریخ ارض القرآن	مولانا سید سلیمان ندویؒ	375/-